عوامی لائبریری سیریز

منہگی کتاب کا سستا ایڈیشن

جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں

ناولٹ

عزیز احمد

قیمت :

عوامی لائبریری سیریز

کے ذریعے

مہنگی کتابوں کے سستے ایڈیشن

۱۔ حرف حرف (نظم) فیض تین روپے
۲۔ چھیڑ غالب سے (ڈرامے) تین روپے
۳۔ انارکلی پر ایک نظر (تنقید) ایک روپیہ
۴۔ پری خانہ (معاشقے) دو روپے
۵۔ رسوم دہلی (مع مقدمہ و فرہنگ) دو روپے
۶۔ شیر کیا سوچتا ہوگا (افسانے) دو روپے
۷۔ چچا چھکن (مزاحیہ) سوا روپیہ
۸۔ بہو کی تلاش۔ اور دوسرے ڈرامے، ڈیڑھ روپیہ
۹۔ ناطقہ بند (مزاحیہ کلام) سید محمد جعفری ایک روپیہ
۱۰۔ غم غلط (مزاحیہ کلام) شوکت تھانوی ایک روپیہ
۱۱۔ جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں (ناولٹ)
از عزیز احمد سوا روپیہ
۱۲۔ دنیا کے مسلمان حکمراں (تاریخ) تین روپے

جزیرۂ سخنوراں (ناولٹ) غلام عباس ایک روپیہ

ملنے کا پتہ

کتاب کار (پبلیکیشنز) رامپور، یو۔پی

۲

یہ پہلی رات نہیں تھی جو ساری بوغانے تاروں کی چھاؤں میں گذاری تھی۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں تھی کہ اس نے المالیک سے سمرقند تک تنہا سفر کیا تھا۔ لیکن جب تارے ڈوب چکے اور آدھا سفر ابھی باقی تھا تو اس نے اپنے سر پر دھوپ کی گرمی محسوس کی۔ حالانکہ ابھی ابھی صبح ہوئی تھی اور آفتاب صبح کا زاویہ ابھی بہت ٹیڑھا تھا۔ اس نے اُٹھ کر انگڑائی لی۔ سر پر آہنی خود پہنا، زرہ لگائی، مشکیزے سے ایک گھونٹ پانی پیا۔ کھانے کو کچھ نہ تھا۔ دُنبے کی پوری کی پوری بھنی ہوئی ران وہ رات ہی کو پوری کی پوری کھا گیا تھا اس سے دو قدم پر ہڈی پڑی ہوئی تھی۔ اس ریگستانی حصے میں سوائے چٹانوں اور ریت کے کچھ نہ تھا۔ پیلے یا ریتلے ٹیلے تھے اور کچھ اور نہ تھا اور دفعتاً اس کے ذہن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ کہ اس کا رفیق غائب تھا۔

اپنے رفیق کو اس نے تھوڑی سی سوکھی ہوئی گھانس رات کو دے دی

تیمور گورگاں سے مخالفت ہوتی۔ اور نہ وہ ہوتا جو ہوا۔ لیکن جو کچھ ہوا وہ اس قابل ہے کہ لوحِ دل پر عبرت کے قلم سے منقش کیا جائے۔"

"بے شک۔ بے شک۔" اور میں نے نصرانی شراب کا ساغر الحاج امیر سیف الدین کی جانب بڑھا دیا۔

امیر سیف الدین نے اپنی پتلی سی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ شراب کا جام اٹھا کے سر ہلایا اور افسانوی انداز ترک کر کے کہا: "میں تمھیں بتاؤں امیر حسین کے زوال کا باعث کیا تھا۔ ایک محض ایک۔ لالچ۔ لالچ۔ لالچ۔ وہ شیخ سعدی کی فرمائی ہوئی بات غلط تھی کہ دو سلطان در اقلیمے نمی گنجند۔ یہ بات نہیں تھی۔ امیر تیمور کو سلطان حسین کا تورا ہونا، چنگیزی ہونا، سلطان ہونا منظور تھا۔ قطعاً منظور تھا۔ لیکن سلطان حسین کی فطرت میں داد و دہش کو دخل نہیں تھا۔ دار و گیر کو دخل تھا اور یہ ہم تاتاریوں، برلاسوں، جلائروں کا عسکری نعرہ ہے۔ دار و گیر۔ دار و گیر۔ لوٹتے جاؤ۔ جمع کرتے جاؤ۔ لوٹتے جاؤ۔ اور جب پرائے نہوں تو اپنے سہی۔

"اے مولانا نظام الدین شامی، آپ کے اس شہر حلب میں بڑے باصفا آئینے بنتے ہیں۔ لیکن جب آئینوں میں بال پڑ جائے، ذرا سی بھی ذرز آ جائے، تو صورت صاف نظر نہیں آتی۔ یہی حال دلوں کا ہوتا ہے۔ انسانوں کے دلوں کا۔ اسی طرح دلوں میں کدورت در آتی ہے۔ جس سے ایک دوسرے کی شکل صاف نظر نہیں آتی۔ اور یہی حال سلطان حسین اور امیر صاحب قراں کا ہوا۔"

اور پھر امیر سیف الدین نے مزاحیہ تصنع سے افسانہ خوانوں کی نقل شروع کی۔

"جب بہار کی فصل آئی، اور سمرقند کے باغوں میں لالوں کے تختے کھلے، جب اناروں کی ڈالیاں سُرخ سُرخ پھولوں سے لد گئیں، جب گلاسوں کے درخت سفید سفید اور گلابی گلابی پوشاکوں میں عروسوں کی طرح جگمگا اٹھے تو سبزہ زار

کے سربداروں نے سمرقند میں سر اٹھایا۔ یہ سربدار بڑے سرپھرے لوگ ہوا کرتے تھے۔ اپنا نام ہی انھوں نے یہ رکھا تھا کہ ان کا سر گویا پھانسی پر لٹکا ہوا تھا۔ بڑے بگڑے دل لوگ تھے۔ مگر بڑے ظالم، بڑے سفاک۔ اور سمرقند میں تین سربدار تھے جنھوں نے قیامت برپا کر رکھی تھی، چغتائیوں کی حکومت سے کم شہر آشوب نہ تھا۔ اور ان تین سربداروں کے نام میرے ان تاتاری مہمان سرداروں کو یاد ہوں گے۔ ایک تو مولانازادہ سمرقندی تھا۔ یاد ہے اس کا ٹھگنا سا قد تھا، اور چھوٹی چھوٹی چکدار آنکھیں، پھیلی ہوئی ناک۔ دوسرا مولانا خُردک بخاری تھا۔ اس کی داڑھی بڑی تھی، مگر قد مولانازادہ سے بھی چھوٹا تھا، اور اسی لئے وہ خُردک کہلاتا تھا کبھی کبھی اسے خرِدک بھی کہا کرتے تھے۔ کیونکہ عقل بھی ذرا چھوٹی ہی تھی۔ مگر جتنی بھی تھی شر ہی شر سے لبریز تھی۔ اور تیسرا ابوبکر نداف تھا۔ جس نے ندافی چھوڑ کے سپہ سالاری شروع کی تھی۔ سمرقند کے کسی گھر کی آبرو ان تین مردکوں کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی۔ کسی کا مال واسباب محفوظ نہ تھا۔ تاجروں نے چین سے فرنگ جانے کا راستہ بدل دیا تھا۔ اور سمرقند کے سید اور خواجہ یہ کہتے تھے کہ ان سربدار قزاقوں سے تو الیاس خواجہ اوغلان اور یکی جوک کے چغتائی مغل ہزار درجے اچھے تھے۔

"سلطان حسین نے سمرقند کا رُخ کیا تو اہل سمرقند نے فصیل کے دروازے کھول دیئے۔ تینوں سربدار گرفتار ہوئے۔ خُردک بخاری کو بڑی اونچی سی پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ جہاں سے اس کا چھوٹا سا قد اور لمبی سی داڑھی بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ ابوبکر نداف کو شہر کے ندافوں کے ہاتھ اتنا پٹوایا گیا۔ کہ وہ قیمہ قیمہ ہو گیا۔ اور اس کا قیمہ چیلوں اور گدھوں کے حوالے کیا گیا۔ لیکن مولانازادہ سمرقندی کی امیر تیمور صاحب قراں نے سفارش فرمائی۔

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

کیوں ؟ یہ مجھے معلوم نہیں ۔ اور نہ اس زمانے کے حالات مجھے ٹھیک ٹھیک یاد ہیں۔"

"لیکن مجھے یاد ہے کہ جہاں مصیبت نے سلطان حسین اور امیر تیمور کو رفیق بنا رکھا تھا، سلطنت اور امارت نے انھیں ایک دوسرے سے دور کرنا شروع کیا۔ جب سلطان حسین نے سربداروں کو گرفتار کیا تو ان کی دولت پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور اس کے بعد سربداروں کی یہ صفت سلطان حسین کی سیرت میں حلول کر گئی کہ دولت جس قدر ہو، جتنی ہو، کافی نہیں۔ سلطان حسین کی لالچ بڑھتی گئی۔ جن سرداروں نے ان کے لئے سر کی بازی لگائی تھی، ان سے متنفر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ہم لوگوں کی باری آئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہو محصول کے حوالے کر دو۔ اسی طرح آق بوغا۔ ایلچی بہادر۔ دولت شاہ بہادر اور امیر تیمور گورگان کے دوسرے جاں باز سردار قید کر لئے گئے کہ اتنا اتنا محصول ادا کرو۔ میرے پاس کہاں سے آتا۔ آق بوغا اور ایلچی بہادر چغتائیوں کے ہاتھوں لٹ چکے تھے۔ ہماری زمینیں کئی سال تک دشمنوں کے ہاتھ رہ چکی تھیں، ہمارے دہقانوں کے پاس بونے کے لئے بیج تک نہ تھے۔ ہمارے چرواہوں کے پاس مویشی تو کہاں مویشیوں کی کھال تک نہ تھی۔ اور اس پر جب ہم نے امیر صاحب قران سے فریاد کی تو امیر تیمور نے سلطان حسین سے عرض کی کہ میرے امیروں کے پاس باقی کیا رہا ہے کہ وہ محصول ادا کریں۔ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ آپ پر نثار کر چکے یا چغتائیوں نے لوٹ لیا یا غارت کر دیا۔ اگر حکم ہو تو انکی طرف سے میں محصول ادا کر دوں۔

"اس پر بھی سلطان حسین نے محصول معاف نہ کیا۔ اور امیر تیمور کو ہماری طرف سے محصول ادا کرنا پڑا۔ اُن کے پاس بھی جمع خزانہ کہاں سے آتا۔ یہ

مولانا نظام الدین جو میں عرض کرنے والا ہوں۔ وہ حقیقت ہے، اور حقیقت ایسی کہ صحیفۂ دل پر بصیرت کی روشنائی سے تحریر کی جائے۔ امیر تیمور گورگان نے ہم لوگوں کے ذمہ جو محصول تھا اس کو ادا کرنے کے لئے اپنی بیوی آغائے معظمہ اولجائی تُرکان آغا کا سارا زیور، سارا زر و جواہر، جملہ گوشوارہ دوستیارہ سلطان حسین کے نذر کر دیا۔ اور سلطان حسین جس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ اس کی اپنی بہن اولجائی تُرکان آغا کا زیور و گوشوارہ ہے۔ اس زیور کو لینے سے بھی انکار نہ کر سکا۔ اور اس واقعہ کے بعد اولجائی تُرکان آغا کا دل ٹوٹ گیا۔ اور انھیں اپنے بھائی سے نفرت سی ہو گئی۔ سلطان حسین نے یہ نہ جانا کہ حرص اور دون ہمتی اور سرداری اور بادشاہی ایک جگہ جمع نہیں ہوتے....."

ایک لمحہ کے لئے امیر سیف الدین نے دم لیا اور دونوں ہاتھوں سے نصرانی شراب کا ساغر اٹھایا۔ رئیس پر میں نے کہا۔

"حکیموں نے کہا ہے کہ کوئی مقام ایسا نہیں جہاں تجمل ہو، اور حسرت اس کے ساتھ ہم آغوش نہ ہونے پائے اور کوئی دروازہ ایسا نہیں کہ طمع اس سے ہو کے گذرے اور ذلت و خواری چاکروں کی طرح اس کے ساتھ ساتھ نہ جائیں۔"

تاتاری سرداروں نے خوش ہو کے سر ہلایا۔ اور امیر سیف الدین نے کہا۔

"القصہ جتنا کچھ محصول امیر صاحب قراں ہم لوگوں کی طرف سے ادا کر سکتے تھے، ادا کیا۔ لیکن تین ہزار دینار پھر بھی باقی رہ گئے۔ اس رقم کے بدلے امیر تیمور نے اپنے خاصے کے گھوڑے پیش کئے۔ معلوم نہیں کہاں سے سلطان حسین کے دل میں عزتِ نفس کا شرارہ بھڑک اٹھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ گھوڑے امیر تیمور کو جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ اس نے یہ گھوڑے واپس کر دیے۔ اور کہا کہ میں سالی سرائے جاتا ہوں۔ مجھے زرِ نقد کی ضرورت ہے۔ جو تین ہزار دینار مجھے ادا

کرتے ہیں وہ ادا کر کے میری مدد کرتا کہ میں یہ پیشگی زر مہر کی صورت میں خوارزم بھیجوں۔ کیونکہ سلطان حسین صوفی کے عزیزوں میں ایک چہاردہ سالہ دختر نیک اختر ہے جس کا نام خوان زادہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسے اپنے نکاح میں لاؤں۔

[اور دلشاد آغا نے انھیں خوارزمیوں سے جنگ کے دوران میں اسے اپنا گھوڑا دیا تھا اور اپنی جان ہلاکت میں ڈالی تھی]

"اس پر امیر صاحب قران نے پس و پیش کی۔ اور عرض کی کہ مال جمع کرنے کی تدبیر کرتا ہوں لیکن آپ کی ہم رکابی سے جدا نہ ہوں گا۔ آپ کے ساتھ سالی سرائے چلوں گا۔ کیونکہ جب کوئی رفیق اپنے سلطان کی نظروں سے دور ہوتا ہے تو دشمنوں کو اس کی مجال ہوتی ہے کہ موقعہ پا کے جھوٹ کو سچ کا لباس پہنائیں اور سلطان کا دل اس کے رفیق کی طرف سے پھیر دیں۔ اس کی مجھ میں طاقت نہیں۔ اور اگر مجھے ہم رکابی اور مصاحبت کی اجازت نہیں ملتی تو پھر یہ اجازت ہو کہ یہ چاکر خانۂ بیت اللہ کا ارادہ کرے۔ اور وہاں اپنے سارے گناہوں کی تلافی میں باقی عمر گذار دے۔ سلطان حسین نے اس کی بھی اجازت نہ دی خود سالی سرائے کا رُخ کیا۔ اور شہر سبز کی سرداری کا پروانہ امیر تیمور گورگان کے نام تحریر کیا۔ اور.....

جرعہ جرعہ شراب پی کے الحاج امیر سیف الدین خاں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں نظام الدین شامی سے کہا۔

"اور..... اور..... امیر موسےٰ والی نخشب کو حکم دیا کہ بہ لطائف حیل امیر تیمور گورگان کو اسیر کرلے"

اور پھر ذرا سرور کے انداز میں سر ہلا کے، قہقہہ لگا کے امیر سیف الدین

نے نخشب کا ذکر چھیڑا۔

"چاہ نخشب ساہ نخشب، شاہِ نخشب" ۔

اس پر اس خاکسار سیچ میرزنظام الدین شامی نے عرض کی "سبحان اللہ۔ سبحان اللہ یا امیر سیف الدین آپ کی تلوار میں ذوالفقار کا سا جلال ہے لیکن آپ کی زبان میں وہ فصاحت اور شیرینی ہے کہ راویوں کا کمال اس کے آگے زوال آمادہ ہے۔ لیکن شرح اس اجمال کی اور تفصیل اس احوال کی عنایت ہو تاکہ میں اسے قلمبند کر سکوں۔

اور مجھ کمبخت نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا یہی لکھا جو امیر تیمور گورگاں چاہتا تھا کہ میں لکھوں]

بڑے پُراسرار انداز میں امیر سیف الدین نے اپنے ہونٹوں کو نصرانی شراب سے تر کیا اور اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر الحمد للہ کہا اور پھر یوں گویا ہوا۔

" بوغایان و بہادران۔ تم میں سے بہتوں نے نخشب کو دیکھا ہے۔ یہ وہی حصار ہے جسے ہم کم علم تورانی قرشی کہتے ہیں۔ اور جہاں ہمارے پرانے رفیق امیر موسیٰ نے ہم سے الگ راستہ اختیار کیا۔ جب ہم سب نے امیر تیمور گورگاں کی رفاقت کا عہد باندھا تو اس نے بجائے نکلتے سورج کے ڈوبتے چاند سلطان حسین جلائر کا ساتھ دیا اور بوغایان و بہادران یاد ہے کہ بوڑھا امیر موسےٰ بڑا حُسن پرست تھا اس کا جیسا حرم شاید ہی ہم میں سے کسی نے جمع کیا ہو۔ ختن کے غزال اور رنجد کی لیلائیں، سُرخ بالوں والی تغلبی مہ لقائیں، نیلی آنکھوں والی یونانی کنیزیں سب اس پیر مرد کے پاس جمع تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ حکیم جالینوس کی لکھی ہوئی کوئی قرابا دین اسے کہیں لوٹ میں مل گئی تھی۔ جس میں بڑی نادر نادر دواؤں اور حیرت انگیز اکسیروں اور طلاؤں کے نسخے تحریر تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ محض

ابو الہوس تھا۔ حسینوں کو اپنے پنجرے میں بند دیکھ لیتا اور خوش ہو لیتا۔ لیکن بڑھے شہباز کے پنجے میں طاقت نہیں تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عبرت کی داستان یہ ہے کہ سلطان حسین کا خون سفید ہو گیا اور اس نے سلطان موسیٰ کو حکم دیا کہ بطائف الحیل امیر گورگاں کو قید کر لے۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اے بوغایان و بہادران آپ سب کو معلوم ہے۔

اور اس پر بوغایان اور بہادران نے سر ہلایا۔ "ہاں امیر سیف الدین"

"تمھیں یاد ہے کہ جب امیر موسیٰ کے رستے ہم پر جھپٹتے، ہم کوہ و دشت و دریا میں منتشر ہو جاتے، اور پھر سمٹ کر اس طرح حملہ کرتے جیسے فاختاؤں کے گروہ پر شاہین۔ یہاں تک کہ امیر موسیٰ کو معلوم ہو گیا کہ کمند اس کے نہیں امیر تیمور کے ہاتھ میں ہے اور جب گلا گھٹنے لگا تو وہ نخشب کی چار دیواری میں جا چھپا۔

"اور نخشب میں اس کا دم گھٹنے لگا۔"

امیر سیف الدین نے قہقہہ لگایا۔ میں نے عرض کی "یا امیر سیف الدین تفصیل اس اجمال کی مرحمت ہو۔"

تب امیر سیف الدین نے کہا۔

اس سال گرمی سارے توران میں غضب کی تھی کہ نہ روئے ارض پر کبھی دیکھی گئی۔ نہ سنی گئی۔ عزرائیل علیہ السلام نے امیر حسین کے زوال کے لئے جہنم کے طبق زمین پر روشن کر دیئے تھے۔ جھاڑیوں میں تیتر بریاں ہو کر جاتے تھے۔ اڑتے ہوئے پرندے کباب بن کر گرتے تھے اور نخشب پر تو خاص عذاب نازل تھا۔ امیر موسیٰ حصار میں محصور تھا۔ اس کی حرم سرا میں اس کے حرم کی نازنینیں محصور تھیں۔ ہر ایک کا گرمی سے برا حال تھا۔ سرخ بالوں والی نقلبی مہ لقائیں جو قپچاق کے مغرب کے دیاروں سے آئی تھیں۔ گرمی سے غش کھا جاتیں۔ ایک کا داغ

چل گیا۔ دوسری نے اپنا جان شیطان کے سپرد کی۔ نیلی آنکھوں والی یونانی کنیزیں وزنابر حرمنوں میں ننگی جا بیٹھیں۔ تین خواجہ سراان کو نظر بھر دیکھنے کے جرم میں قتل کئے گئے۔ ختن کے غزال گرمی سے بے حال تھے۔ نجد کی لیلاؤں کے منہ سے ہذا نیں نکلی پڑتی تھیں۔ امیر موسیٰ ان کے قریب پھٹک نہ سکتا تھا۔ کیونکہ گرمی سے سب پسینے میں شرابور رہتیں اور پسینے کی عفونت عود اور عنبر اور عبیر اور مشک پر بھاری تھی۔ ایک چینی سوداگر جو فرنگ کے لیے ریشم کا سامان لے جا رہا تھا۔ ہمارے ہاتھ پڑا اور اس نے نخشب کی گرمی کی یہ سرگذشت امیر صاحب قراں سے بیان کی۔ اور اس پر امیر صاحب قراں نے اپنے خیمے میں ہم سب کو طلب کیا۔ مرحوم ایلچی بہادر کو، اور جاکو برلاس کو، مجھے اور معاوہ اور آق بوغا کو اور کہا: "یہ بڑا ستم ہے کہ ہم سخت جان سپاہی آمو دریا کی ٹھنڈی وادیوں اور بدخشاں کے خنک پہاڑوں کی ہوا کھائیں۔ اور ہمارے ڈر سے امیر موسیٰ کے حرم کی نازنین اور حسین عورتیں حرم سرا کی بند دیواروں میں جھلسیں۔ میرا ارادہ ہے کہ امیر موسیٰ اور اس کے حرم کی دلنشین عورتوں کو چشموں کی ٹھنڈی وادیوں کی سیر کرائی جائے۔

"ہمیں جو کاروان ہرات سے آتے ملے، ہم نے ان کی خاطر مدارات کی۔ امیر گورگاں نے جتنا مال خریدا اس سے دُگنا انعام دیا۔ کاروان کے تاجروں کے سامنے ملک ہرات کے سفیروں کو باریاب کیا اور ہرات آنے کی دعوت قبول کی۔ تاجر بہت خوش تھے۔ ان کے کاروان نے نخشب کا راستہ سنبھالا۔ اور ان کی نظروں کے سامنے ہم ہرات کے راستے پر ہولئے۔ ہمارے گھوڑے مُرغاب کے کنارے کنارے دونوں طرف جنوب کی جانب بڑھنے لگے۔ اور کارواں کے تاجروں نے امیر موسیٰ کو جا کے یہی اطلاع دی کہ امیر تیمور گورگاں اور اس کا لشکر ملک ہرات کی دعوت پر مُرغاب کے کنارے کنارے ہرات اور بامیان کی سمت گرمیاں گذارنے جا رہا ہے۔

بوغا نے امیر تیمور کی فراست کی داد دی اور کہا ماشاء اللہ۔

امیر سیف الدین نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ خادموں کو دسترخوان بڑھانے کا اشارہ کیا، اور سب سے پہلے منہ میں انگلی ڈال کے دانت صاف کئے، کلی کی غرارہ کیا، اور تر کی رومال سے ہاتھ پونچھ کر یوں گویا ہوا۔

"جب آفتاب عالم تاب نے قزل قم کی لال پہاڑیوں میں منہ چھپایا۔ تو ہم نے اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچیں اور ان کا رُخ موڑ دیا۔ ہمارے جاسوسوں نے آکے خبر دی کہ تاجروں نے جو دیکھا تھا۔ امیر موسیٰ سے عرض کر دیا اور امیر موسیٰ اپنے حرم کی سنہرے بالوں والی اور سُرخ بالوں والی اور سیاہ بالوں والی۔ دو زلفوں والی، ایک زلف والی اور کئی زلفوں والی۔ غزالی چشم والی اور سیاہ پُتلیوں والی اور نیلی آنکھوں والی چینی ناک والی اور یہودی ناک والی حسیناؤں کے جم غفیر کے ساتھ سرد آب کے نخلستان میں عشرت کی داد دے رہا ہے۔ نخلستان بہشت بن چکا ہے۔ جہاں حوریں بخارا اور قوقند کے قالینوں پر دراز ہیں اور دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں جو مرد ہیں مخمور ہیں۔ عورتیں اس ٹھنڈے چشمے کے قریب نخلستان اور بادیہ کی ٹھنڈی ہوا سے مسرور ہیں قریب کے نخلستان میں امیر موسیٰ کے دوسرے ساتھی ہیں اور کاشی کے جھلملاتے ہوئے در و دیوار امیر صاحب قراں پہ نثار ہونے کے انتظار میں سر براہ ہیں۔

ہم نے تیری رائے سے یلغار کیا۔ امیر صاحب قراں کا قدم سب سے تیز تھا۔ انھوں نے جاکو برلاس کے ساتھ پل کے سائے سائے چھپ کر خندق کو پار کیا۔ میرے خیال میں امیر صاحب قراں نے اس روز ذرا زیادہ کومیس پی لی تھی سرور کے عالم میں انھوں نے دروازے پہ دستک دی۔ لیکن امیر موسیٰ کا بیٹا، اور محصور دستہ یا تو گرمی سے بیہوش تھے یا غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ ان

تھی۔ اپنے مشکیزے سے تھوڑا سا پانی بھی دیا تھا۔ حالانکہ یہ جنس بہت قیمتی تھی۔ پھر اس نے اسے کمند کی رسی سے گرہیں دے کر ایک نکیلی چٹان سے باندھ دیا تھا۔ رات کو اسے یاد تھا کہ ایک آدھ بار اس نے اپنے رفیق کے ہنہنانے کی آواز سنی تھی۔ پھر وہ ایسا غافل سویا کہ اسے نہ دنیا کی خبر رہی نہ آخرت کی۔ اور اب جب صبح کا اعلان نہ مرغ سحر نے کیا نہ سمر قند کی طرح کوؤں کی کائیں کائیں نے اور آفتاب نے ریگستان میں سوا نیزے پر سر نکالا تو اس کا رفیق غائب تھا، زین، رکاب، لگام سمیت۔

اس کا احتمال کم تھا کہ کوئی چور آکے اس کے پستہ منگول ٹٹو کو لے گیا ہو کیونکہ ریت میں دور دور تک کسی کے قدموں کے نشان نہ تھے۔ ساری بوغائے سب سے پہلے یہ اطمینان کر لیا، نہیں بے وفائی اس کے رفیق نے کی تھی جو عام طور پر وفادار تھا۔ معلوم نہیں اس وحشی جانور کے دل میں کیا سمائی جو کسی نہ کسی طرح رسی چھڑا کے بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک دوسرے کے بغیر ریگستان دونوں کے لیے موت تھا لیکن بھاگتے وقت اس کے رفیق نے یہ بھی نہ سوچا۔ جانور جو ٹھہرا۔

ساری بوغائے مشکیزہ کمر سے باندھا، تلوار لگائی، اور گھوڑے کے سم کے نشانات ڈھونڈھتا ہوا روانہ ہوا، تھوڑی دور تک تو چمکتی ہوئی ریت پر نشانات صاف صاف نظر آتے، پھر تھریلی زمین یا کوئی ٹیلہ آجاتا اور نشانات چھپ جاتے معلوم ہوتا تھا بے وقوف جاندار نے واپس الممالیک کا رخ کیا تھا۔ ویسے یہ بڑا بزدل، ناخلف ٹٹو نکلا۔ حالانکہ اس کے آباو اجداد نے چنگیز کے ساتھ نکل کر دنیا فتح کی تھی۔ روس کی چراگاہوں میں جاڑوں میں سموں سے برف کھود کھود کے گیلی جمی ہوئی گھانس کھائی تھی، اور ایران کے ریگزاروں کو تپتی ہوئی دھوپ میں طے کیا تھا۔ ساری بوغا میں ابھی تک مغلوں کی سخت جانی باقی تھی۔

کے سروں پر قضا کھیل رہی تھی۔ امیر صاحب قراں نے فصیل کا معائنہ کیا رخنہ کے لئے مقامات کی نشان دہی کی اور دوبارہ خندق پار کی۔ اب کے جاکو برلاس، آق بوغا، میں اور بہت سے جاں نثار ان کے ساتھ تھے۔ ہم نے کمندیں لگائیں دیواروں پر چڑھ گئے۔ محصور دستے میں سے کچھ نیک بختوں نے اطاعت کے لئے گھٹنے ٹیک دیئے، اور اپنے میان سے تلواریں نکال کر امیر صاحب قراں کے قدموں پر ڈال دیں۔ جو کمبخت لڑے انھیں ہم نے تہہ تیغ کیا۔ جو قلعہ میں مقابلے کے لئے جمع ہوئے ان پر ہم نے آتش نفط برسائی اور انھوں نے بھی اطاعت کرلی۔ ایک رات میں نخشب اس طرح ہمارے ہاتھ آیا جیسے کوئی کھیل کھیلتا ہے۔ امیر موسیٰ کے حرم کی کچھ معتوب عورتیں جنھیں وہ اپنے ساتھ سرد آب کے نخلستان نہیں لے گیا تھا۔ امیر صاحب قراں نے ان عورتوں کو خواجہ سراؤں اور مجرب طلاؤں کی شیشیوں کے ساتھ امیر موسیٰ کے پاس اسی رات بھجوا دیا، اور اس طرح اسے نخشب کے چھن جانے کا پتہ چلا۔ اور بہت جلد سلطان حسین کو بھی اس کا علم ہوگیا۔"

پھر الف لیلہ کے افسانہ گو کے انداز میں امیر سیف الدین نے مجھے مخاطب کیا "اے پیر مرو شاہی۔ یہ داستان عجیب ہے لیکن سچ ہے کیونکہ کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو افسانوں سے زیادہ عجیب ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں چاہ نخشب اور ماہ نخشب کا افسانہ افسانہ ہے اور یہ حقیقت ہے.....؟"

میں نے عرض کی "یا امیر سیف الدین ایک تو امیر صاحب قراں کا زمانہ اور پھر آپ کا سحر بیان۔ اس کا لفظ لفظ میں کبھی نہ فراموش کروں گا۔"

لیکن داستان سرائی سے ابھی امیر سیف الدین کا جی نہیں بھرا تھا اس نے مرتبان کے گاؤ تکیہ کا سہارا لگا کے پاؤں پھیلا دیئے۔ لیکن واضح رہے اے مولانا

نظام الدین شامی کہ مقنع کے ماہ نخشب کا افسانہ روایت کے لحاظ سے کمزور سہی آنکھوں دیکھی بات نہ سہی، لیکن دلچسپ ہے۔ ہمیں یاد ہے۔ اسی رات کو جب ہم نے نخشب فتح کیا۔ امیر صاحب قراں کا جی چاہا کہ تازہ کو میس پی جائے، ہمارے پاس جو کو میس تھی وہ کئی دن پرانی تھی، میں نے امیر صاحب قراں سے عرض کی۔ نخشب میں قرا سرائے کی کو میس مشہور ہے، تاشقند تک اس کی شہرت ہے۔ اور امیر نے گھوڑے کو ایڑ لگا کے کہا چلو۔ ہمارے سپاہی شہر میں لوٹ کھسوٹ کر رہے تھے اور اس فتح کے بعد امیر کا وہی حال تھا جو اکثر ہوا کرتا ہے، جیسے کوئی شطرنج کی بازیاں جیتتے جیتتے اکتا جاتا ہے اور لات مار کے بساط بکھیر دیتا ہے۔"

اور امیر سیف الدین نے قالین کے فرش پر اس طرح لات ماری گویا وہ کسی بساط کو بکھیر رہا ہے۔

پھر امیر سیف الدین نے کہا: "سرائے میں بھی ہمارے سپاہی مسافروں کو لوٹ رہے تھے۔ امیر صاحب قراں کی للکار سن کے ہمارے سپاہی کھسک کے نکل گئے میں نے سرائے کے مالک کی مکر پر لات جمائی۔ وہ دہرا ہو گیا میں نے کہا امیر تیمور گورگاں کے لئے فرش بچھا۔ راویوں کو بلا، تازہ کو میس قدحوں میں بھر بھر کے نکال۔ چشم زدن میں اس نے حکم کی تعمیل کی۔ معلوم نہیں کہاں سے ایک اندھے راوی کو پکڑ لایا۔ مگر اس کا طرز بیان بڑے غضب کا تھا۔ اور اس راوی نے امیر صاحب قراں کی فرمائش پر مقنع کے ماہ نخشب کا قصہ سنانا شروع کیا۔

اور امیر سیف الدین نے آنکھیں بند کر لیں۔ گویا وہ اندھے راوی کے ٹھیک ٹھیک الفاظ یاد کرنے اور دہرانے کی کوشش کر رہا ہے، اور پھر اس نے کہا: "اس بدذات۔ بدگہر، بدنہاد، بے بصر راوی نے امیر صاحب قراں کو مخاطب کر کے حکایت یوں شروع کی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۱۲

"اے امیر تیمور صاحب قراں، اے سالار عساکر فاتحاں۔ پہلے حمد و ثنا اس خدائے ذوالجلال کو جس نے مجھے قوت گویائی بخشی، بصارت سے محروم کیا، جس نے سکندر و چنگیز کو ظفر یابی بخشی اور بصیرت سے محروم کیا۔ اس روایت کی اصلیت اسی پر روشن ہے، اس حکایت کی حقیقت اسی پر ظاہر ہے۔ کیونکہ وہی علیم ہے، وہی حکیم ہے، وہی خبیر ہے، وہی صاحب تدبیر ہے۔ اُسی نے دریا بہائے، پہاڑ اٹھائے، بادل برسائے انسان بنائے اسی نے انسانوں سے کنوئیں کھدوائے۔ اور اے امیر صاحب قراں ایسا ہی ایک کنواں اس شہر نخشب میں بھی ہے جس کی روایت یہ راوی بیان کر رہا ہے، جس کی حکایت میں حکمت کا رمز ہے، جسے جو صاحب فہم ہے، خدا کرے سمجھے جو ادراک سے محروم ہے۔ خدا کرے نہ سمجھے۔

"اے امیر کارواں، امیر گورگاں کنوئیں کنوئیں کا بھید الگ ہے۔ چاہ

چاہ کی بات ہے، ایک ہے چاہ ذقن جس میں شاعر کا دل ڈوبتا ہے۔ ایک تھی چاہ بابل جس میں ہاروت اور ماروت کو نظر بند کیا گیا، جو پہلے فرشتے تھے، ایک رنڈی کے فریب میں آگئے، آنکھ کا دھوکا کھا گئے۔ اس کے ہو بیٹھے، عقل سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اُس رنڈی پر اُس کریم کو رحم آگیا، اسے چمکتا ہوا ستارہ بنا دیا۔ اے میرے آقا چاہ بابل جھوٹا کنواں ہے۔ کوئی کوئی کنواں سچا ہوتا ہے جیسے چاہ کنعاں۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے پیاروں کی تربیت ہوتی ہے، ہدایت ہوتی ہے عجیب شیریں حکایت ہوتی ہے۔ چاہ کنعان سے ماہ کنعان یوسف کو پیغمبری ملی۔ چاہ نخشب سے المقنع کا ماہ نخشب طلوع ہوا، جو اے میرے آقا جھوٹے کنویں کا جھوٹا چاند تھا۔

اے میرے آقا یہ امام تلبیس، یہ شاگرد ابلیس المقنع الکندی تنگ عرب، شرم عجم اس شہر نخشب میں خدائی کا دعویدار تھا۔ خلق کو اس کے دعوے پر اعتبار تھا کیونکہ اس چاہ باطل، اس چاہ نخشب سے ہو اندھیری رات اس کے اشارے سے ایک چاند طلوع ہوتا، اور آسمان پر بلند ہوتا جاتا، فضا بقعۂ نور ہو جاتی چاندنی کا نور ظہور ہوتا، ارض سے سماتک سفید روشنی پھیلتی۔ سب اس معجزے سے حیران تھے، دلوں میں ایمان ویران تھے۔ کوئی کہتا کہ یہ معجزہ ہے، جو صاحب ایمان ہوتا اپنے دل میں کہتا کہ یہ شعبدہ ہے، کوئی روایت کرتا کہ مقنع اصل میں بڑا ماہر کیمیا گر ہے۔ کیمیا گری سے ایک طبق روشن کو زمین اور آسمان کے درمیان معلق کرتا ہے، ساری دنیا کو اوہام میں مستغرق کرتا ہے۔ کوئی کہتا کہ یہ نظر بندی کا کھیل ہے، نظر کا دھوکا ہے۔ بصارت جھوٹی ہے، بصیرت سچی ہے۔ غرض مقنع کی شہرت دور دور پہنچی۔ اس کے دربار میں تاجر آئے۔ شاعر آئے، سپاہی آئے درباری آئے۔ سردار آئے سربہ دار آئے۔ اے امیر با تدبیر ایک دن اس کے

دربار میں ایک حسین جوان آیا، تیغ سے تبر سے، ترکش سے، خود سے جوشن سے، زرہ سے آراستہ۔ بلند بالا۔ اس کی پیشانی پر حوصلے کا ستارہ چمکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شجاعت کا شرارہ دمکتا تھا۔ اس کا نام قوقلمش تھا۔ وہ قوقند کار ہنے والا تھا، لیکن سیج دھج میں تورانیوں سے نرالا تھا۔ جب مقنع نے اسے اپنے دربار میں دیکھا اور اپنا معتقد پایا تو دل میں یہ خیال لایا۔ یہ ہے وہ نوجوان جو میری فوجوں کی سالاری کرے گا۔ یہ وفاداری سے میرے عساکر کی سرداری کر سکے گا۔ لیکن اس کی وفاداری مکمل ہونی چاہیئے۔ اور اس نے سوچا کر اسے ایک ایسی ناظورۂ طناز محبوبۂ عشوہ ساز سے منسلک کیا جائے کہ پھر یہ نخشب کے دربار سے ہلنے نہ پائے۔

مقنع نے کہا اے نوجوان تو قند کار ہنے والا ہے، نوجوان نے کہا ہاں مقنع نے کہا تو نے اتنے سال خراسان میں گنوائے۔ نوجوان نے کہا ہاں۔ مقنع نے کہا پھر تو بغداد گیا جہاں جھوٹا خلیفہ رہتا ہے جس کا علم سیاہ ہے۔ نوجوان نے کہا ہاں۔ مقنع نے کہا، پھر دمشق آیا۔ جہاں تو نے ایک نصرانی کنیز خریدی جس کا نام نائلہ تھا۔ اور تجھے اس کنیز سے عشق تھا۔ نوجوان نے حیران ہو کر کہا ہاں۔ مقنع نے کہا پھر تجھے لڑائی میں رومی سپاہی انطاکیہ کے قریب پکڑ کے لے گئے اور تو نے چار سال قسطنطنیہ میں گنوائے۔ جو قیصر کا دربار ہے، اور جو دو سمندروں اور دو زمینوں کے درمیان آباد ہے، نوجوان قوقلمش نے حیران ہو کے کہا ہاں تجھ پر میرا سب حال روشن ہے۔

اس وقت مقنع کا جھوٹا چاند اس شہر قرشی، اس شہر عرشی، اس شہر نخشب اس شہر منتخب پر چمک رہا تھا قوقلمش کی آنکھیں اس کی ضو سے خیرہ تھیں۔ باطن کی نظریں تیرہ تھیں۔ مقنع نے کہا مجھے سب معلوم ہے کیونکہ میں وہ روح ہوں جو زندہ ہے میں قوت تخلیق ہوں جو تابندہ ہے، یہ ارض و سما

میرے ہیں، یہ مرغ و سمک میرے ہیں۔ میں نے تجھے اور تجھ جیسوں کو پیدا کیا ہے۔ اس جنم میں، اور اس سے پہلے کے ہر جنم میں۔ میں نے تجھے جادی بنائی بنایا میں نے تجھے حیوان انسان بنایا۔ میں نے تجھ کو اور نائلہ کو حبیب اور محبوب بنایا۔ اس سے پہلے میں نے تمھیں آدم اور حوا بنایا۔ سلیمان اور بلقیس، بلکہ سبا بنایا تھا۔ قیس و لبنیٰ بنایا تھا۔ میں نے تیرے امتحان کے لئے تجھے رومیوں کے ہاتھ قید کیا، پھر ایمان کی شمع تیرے دل میں جلائی اور بغداد تیرہ روسیاہ سے تجھے اپنی خدمت میں نخشب کھینچ بلایا۔ تیرے ہاتھ کو طاقت تیری تلوار کو تیزی بخشی تاکہ تو اسے عربوں کے خداؤں کے خدا کے خلاف میری حمایت میں کھینچے۔ جا آج رات میں تیری نائلہ کو میں تیرے سپرد کر دوں گا۔

اے امیر صاحب قراں یہ نصرانی کنیز نائلہ عجب شعلۂ جادو بیکر تھی۔ اس کا وطن لبنان تھا۔ اس کی نظروں میں ایک طرح کا وجدان تھا۔ جب اس کا مالک قوقلش رومیوں کے ہاتھ اسیر ہوا، اس سے دور ہوا جب کتاب تقدیر میں یہ مذکور ہوا، تو یہ اس کے عشق میں حیران و سرگرداں ہوئی، اس کی آنکھوں سے سرشک خون جاری ہوا۔ اس پر ایک طرح کا جنون طاری ہوا، اس عالم میں یہ گھر سے باہر نکلی۔ ایک بردہ فروش نے اسے پھر سے اسیر کیا۔ اسکے جنون کا وہی عالم تھا کیونکہ جنون عشق ہجر میں کم نہیں ہوتا۔ جنون کا سلسلہ بے وصال محبوب برہم نہیں ہوتا۔ اے امیر اس بردہ فروش کے ساتھ وہ پیروت سے دمشق آئی۔ دمشق سے بغداد آئی، بغداد سے تبریز آئی، تبریز سے ترشیز آئی، ترشیز سے نخشب آئی اور نخشب میں مقنع کے خواجہ سراؤں کو معلوم ہوا ایک ماہ آسمان خوبی، ایک بدر سمائے محبوبی، ایک بت آفتاب طلعت، ایک لعبت مصور صورت بازار میں بک رہی ہے، اور انھوں نے مقنع سے

عرض کی، اور مقنع نے اس کو خریدنے کا حکم دیا۔

"اے آقا جب مقنع نے اسے اپنے حضور میں بلایا تو چاہ نخشب آسمان پر چمک رہا تھا۔ ارض و سما کا ذرہ ذرہ دمک رہا تھا۔ مقنع کے چہرے پر نقاب تھی۔ یہ نقاب اس کی دائمی حجاب تھی۔ کسی نے مقنع کی صورت نہ دیکھی تھی۔ وہ خدائی کا دعویدار تھا۔ کس کی مجال تھی کہ چہرۂ الوہیت بے نقاب دیکھے اس جلوہ باطل کو جو جلوہ حق ہونے کا دعویدار تھا بے حجاب دیکھے کسی نے مقنع کی صورت نہ دیکھی تھی۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ سفید سی نقاب پڑی رہتی۔ اور اس کے پیروؤں کو اعتقاد تھا کہ جس دن مقنع کے چہرے سے نقاب اٹھے گی یہ دنیا اس کے جلوۂ بے حجاب کی تاب نہ لائے گی۔ ساری خلق مر جائے گی۔ خاکستر ہو جائے گی۔

"جب یہ لبنانی کنیز نائلہ مقنع کے حضور میں آئی تو بہکی بہکی باتیں کرتی تھی۔ اپنے پرانے آقا، اپنے محبوب قوقلمش کو یاد کرتی تھی۔ روتی جاتی تھی جان کھوتی جاتی تھی۔ تب اس سے مقنع نے کہا "اے کنیز تو جانتی ہے تو کون ہے؟ تو عورت کا حسن ہے۔ میں نے تجھے پیدا کیا۔ تیرے محبوب قوقلمش کا عشق عشق مجازی ہے۔ جو ابتدا ہے۔ انتہا نہیں جو مرحلہ ہے مدعا نہیں اے کنیز نائلہ ہوش میں آ۔ دیکھ میں نے یہ چاند بنایا جو اس چاہ سے نکلا ہے اور جس سے آسمان جگمگا رہا ہے۔ دیکھ میں نے تجھے چاند جیسا حسن عطا کیا۔ تاکہ تو میرا عشق پہچانے اے کنیز اے نائلہ کیا تجھے دمشق کے حکیموں نے، بیروت کے دبیروں نے نہیں بتایا کہ عشق مجازی پہلی منزل ہے اور عشق حقیقی آخری منزل۔ اور میں مقنع ہوں، خدائے خراسان، جس کے نقاب کے پیچھے الوہیت کا جاہ و جلال ہے۔ اے کنیز اٹھ اور عشق مجازی سے نجات پا۔ میں نے

تجھے نجات بخشی۔ اے کنیز اٹھ۔ اور عشق حقیقی سے حیات پا۔ میں نے تجھے حیات بخشی۔

"اے میرے امیر صاحب قراں کچھ جھوٹے چاند کی چمک تھی، کچھ جھوٹے لفظوں کی دمک۔ وہ کنیز اس جادو میں ہے، اس طلسم، اس طلسمات اس ظلمات میں پھنس گئی۔ اس کا جنون جاتا رہا۔ اسے ہوش آگیا، جو جنون سے بدتر تھا۔ اس نے مقنّع کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ مگر وہ اس پر فریفتہ ہوگئی اس نے نصرانی مذہب چھوڑا۔ اس امام تلبیس کے عشق کا دامن پکڑا۔ وہ اس کے عشق میں اس درجہ گرفتار ہوئی کہ جس کی نہ کوئی حد تھی نہ کوئی انتہا۔

"یہاں تک کہ مقنّع کا دل اس سے بھر گیا۔ مقنع کا جوش اتر گیا۔ نئے نئے بردہ فروش آئے، چین سے، فرنگ سے، روس سے نئی نئی کنیزیں لائے، کچھ کالی، کچھ پیلی، کچھ سفید۔ لیکن نائلہ اب بھی ضد کرتی کہ اس خدائے نخشب کی اصلی محبوبہ وہی ہے۔ وہی اس کی مریم ہے۔ وہی اس کے عشق کے لئے حسن ہے، وہی اس کے جلال کا نسوانی جمال ہے۔ اور مقنّع کا دل اس کی طرف سے سرد ہوتا جاتا ہے۔

"اے امیر باتدبیر جب قوقلمش کی قسمت اسے نخشب کھینچ لائی، تو مقنّع جو اس کا قصہ پہلے ہی نائلہ کی زبانی سن چکا تھا، جو پہلے ہی تدبیر کا جال بن چکا تھا۔ چاہتا تھا کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ نائلہ سے نجات ملے، اور قوقلمش اس کے ذریعہ ہندھا رہے، بلنے نہ پائے، جانے نہ پائے اس کی خدمت میں جان گنوائے۔

• مقنّع نے سر شام نائلہ کو طلب کیا۔ کہا کنیز سن۔ سن اور کہنا مان ہم نے اپنی قدرت سے تیرے محبوب کو رومیوں کے چنگل سے چھڑایا ہے،

ہم نے تو قلمش کو اپنے قدموں میں جانثاری کے لئے نخشب بلایا ہے۔ یہ ہماری مرضی ہے، یہ ہماری مشیت ہے، یہ ہمارا حکم ہے۔ یہ ہماری حکمت ہے یہ ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم آج سے تجھے پھر اس کے سپرد کرتے ہیں۔

کنیز یہ سن کر دم بخود ہوئی۔ اس کا رنگ زرد ہوا اس کی نبض سرد ہوئی۔ اس نے عرض کی اے خداوند، اے ماہ نخشب کے خالق، اے چاہ نخشب کے مالک۔ تو نے مجھے عشق مجازی کے ہجران سے، عشق مجازی کے بحران سے نجات دلائی۔ تو نے مجھے عشق حقیقی میں قبولا۔ میں نے تیرے جمال نقاب پوش سے عشق کیا، عقد کیا۔ اب یہ رجعت کیسے ممکن ہے؟ عشق حقیقی کے بعد تو عشق مجازی کی منزل نہیں آتی۔ یہ مراجعت کیسے ممکن ہے؟

مقصہ مختصر اے امیر صاحب قراں جوں جوں مقنع اسے سمجھاتا وہ اور بضد ہوتی جاتی، روتی جاتی وہ کسی طرح اپنے پرانے محبوب کی طرف مائل نہ ہوتی عشق مجازی کی سائل نہ ہوتی یہاں تک کہ مقنع نے اس سے کہا اے کنیز ک بے خرد یہ راستہ جو میں نے تجویز کیا ہے میری مصلحت ہے۔ میں تجھے اپنے اور اس نوجوان قرقلمش کے درمیان واسطہ بنانا چاہتا ہوں۔ اس پر وہ کنیز نائلہ از بس کہ عورت تھی حجت کرنے لگی اے خداوند تیرا کام رحمت ہے زحمت نہیں، تجھے لشکر کی کیا ضرورت، تجھے جنگ وحرب سے کیا واسطہ۔ تیرا کام تو معجزوں کا ظہور ہے تو اور سورج اور چاند بنا۔ اور مجھ سے محبت کرتا رہ۔ اس کنیز ک نے اسے طعنہ دیا کہ تو کیسا خدا ہے جو انسانوں کی طرح لشکر فراہم کرنا چاہتا ہے، اپنی نقاب اٹھا اور دنیا در ہم برہم کر دے۔

اس پر مقنع کو طیش آگیا اور اس نے اپنی نقاب کھینچ کر اتار دی کنیز ک نائلہ چیخ مار کر پرے ہٹ گئی۔ کیونکہ اے امیر صاحب قراں،

اے سالار عساکر فاتحان مقنّع کا چہرہ ابلیس کا غول بیابانی کا بھیانک چہرہ تھا، اسکی ناک پر ایک بڑا سوراخ تھا جس سے حلق تک کا گوشت صاف نظر آتا، اس کے ہونٹ گردوں کے برابر موٹے موٹے تھے، اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔

طیش کے عالم میں مقنّع نے کنیز نائکہ کے بال کھینچے اور اس کی صورت اپنے گھناؤنے اور مکروہ چہرے سے قریب کی۔ اس نے کہا دیکھ کنیز یہ صورت خدا کی نہیں شیطان کی ہے۔ تیرے خدا نے، بغدادیوں کے خدا نے میری صورت بنائی اور اس لئے میں نے اس سے بغاوت کی۔ میں نے خدائی کا دعوی کیا۔ میں نے غول بیابانی کے ہاتھ روح بیچی۔ میں نے سحر سیکھا۔ میں نے جادو کیا، میں نے کیمیاگری کی، تاکہ میں اس کے خلاف بغاوت کروں لشکر جمع کروں اور اس کی مخلوق کو قتل کروں، غارت کروں، تباہ کروں تاراج کروں...... میں اس سے اپنی بدصورتی کا بدلہ لوں.....“

یہاں تک راوی کا بیان سناتے سناتے امیر سیف الدین نے یکلخت کہا۔ وہ بدنہاد، بدگہر راوی یہ کہتا جاتا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ آگے پھینکتا جاتا تھا، گویا وہ امیر صاحب قراں کی اس ٹانگ کی طرف اشارہ کر رہا تھا جو سجستانیوں سے جنگ میں خدنگ جستہ میں بسمل ہوئی تھی..... میرا ہاتھ تلوار کے قبضے پر پڑا۔ مگر امیر صاحب قراں نے مجھے اشارے سے روک دیا کہ راویوں کو قتل نہیں کرتے.....

نصرانی شراب کا ایک اور جام خالی کر کے امیر سیف الدین نے نخشب کے راوی کی حکایت پھر یوں شروع کی۔

” القصّہ اے امیر صاحب قراں غصہ میں مقنّع وہ سب کچھ بیان کر گیا،

تیمور اور سلطان حسین کے ساتھ رہ کر بھی اس نے اپنی وضع نہ بدلی۔ وہی لمبی لمبی مونچھیں دونوں رخساروں پر بچھو کی ٹوٹی ہوئی ڈنک کی طرح جھکی ہوئی اور ٹھڈی پر وہی مختصر سی داڑھی، گردے اٹی ہوئی۔

دھوپ ہر لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ گھوڑے پر یہ دھوپ کچھ نہیں تھی۔ کیونکہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، گھوڑا اس کے جسم کا گویا نصف حصہ تھا۔ اس کے بغیر اس کی زندگی، اس کا وجود، اس کا جسم نامکمل تھا۔ وہ دماغ تھا، قوی بازو تھا، تلوار تھا، مگر قدم، رفتار، حرکت یہ سب گھوڑے کا کام تھا اپنی زندگی میں ساری بوغا نے کبھی اپنے آپ کو اس قدر مجبور محسوس نہیں کیا تھا جیسے اس تپتی ہوئی صبح کو، اس جھلستے ہوئے ریگستان میں پیادہ پا۔

جب گھوڑے کی ٹاپوں کے نشان غائب ہو جاتے تو ساری بوغا کسی ٹیلے پر چڑھ کے دیکھتا، اور تھوڑی دور پر پھر نشان نظر آتے، اور پھر ٹیلے پر سے اترتا۔ اس مرتبہ جو وہ ایک ٹیلے پر چڑھا۔ تو اس نے ایک ویران سا مینار دیکھا کسی مسمار عمارت کا مینار جو اس لق و دق ریگستان میں معلوم نہیں کس نے بنائی تھی؟ غالباً خوارزم شاہیوں نے۔ غزنوں یا مغلوں یا شمال کے شہسواروں کی نقل و حرکت دیکھنے کے لیے، اور اب بھی یہ نامکمل مدور مینار اس ریگستان میں کھڑا تھا۔ اس امر کی واحد علامت کہ یہاں انسان کا بھی گذر ہوتا رہا ہے۔ ورنہ اس کڑکتی ہوئی دھوپ میں کسی جاندار کا پتہ نہ تھا۔ نہ کوّے کی کائیں کائیں تھی، نہ گیدڑ کی آواز۔ آسمان پر اکیلا ایک گدھ منڈلا رہا تھا۔

ساری بوغا نے جلدی سے مینار کا رُخ کیا۔ یہی ایک موقع تھا۔ اگر مینار پر چڑھنے کی سیڑھیاں ہوں، یا کم سے کم دیوار میں کچھ پتھر ایسے ہوں جن کے سہارے اور چڑھا جا سکے تو اطراف میں بہت دُور دُور تک کا علاقہ نظر آئے گا، اور کہیں

وہ ساری حقیقت عیاں کر گیا، جو اسے پوشیدہ رکھنی چاہیئے تھی۔ نائلہ نے کپڑے بدلے، سنگھار کیا، اور دیباؤ اطلس کے ایک شامیانے میں پھولوں کی سیج پر قوقلش کا انتظار کرنے لگی۔

"جب قوقلش دیوانہ وار اس کی طرف بڑھا، تو اس نے اپنا نقاب الٹ دیا۔ قوقلش نے دیکھا کہ اس کے ابرو ننڈھال ہیں، اس کے شانے بے حال ہیں۔ اس کا رنگ زرد ہے۔ اس کی سانس سرد ہے۔ گویا وہ اس کی نائلہ نہیں کوئی اور ہے۔ اس کوئی اور کا کچھ عجیب ہی طریق، عجیب و غریب طور ہے۔

اس نے نائلہ کو پیار کیا تو اس کے ہونٹ ٹھنڈے تھے، اس نے اس کی نبض ٹٹولی تو نبض سست تھی۔ اس نے کہا "اے نائلہ خدائے نخشب نے ہمیں اکٹھا کیا۔ لیکن تیرے دل میں میری محبت مر چکی ہے۔"

"نائلہ نے تڑپ کر پیچ و تاب کھا کے کہا" نہیں اے میری جان، اے میرے محبوب مجازی، اے میرے واحد محبوب بات نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے تیرے سوا کسی سے محبت نہیں کی، کسی سے الفت نہیں کی، مگر میں تجھے اسی محبت کی سوگند دیتی ہوں کہ بھاگ یہاں سے بھاگ۔ مقنع کی نقاب کے پیچھے خدا نہیں، ایک جھوٹا درندہ ہے جو خلق خدا کا خون پینا چاہتا ہے بھاگ اور سچے خدا کے ملک کو سدھار۔ نخشب کا خدا جھوٹا ہے" اور پھر نائلہ نے مقنع کی اصل شکل و صورت قوقلش سے بیان کی، ساری بات بتائی ساری حقیقت سنائی۔

"اے امیر صاحب قراں، جب امیر المومنین مہدی العباسی خلیفہ بغداد نے نخشب کا محاصرہ کیا، جب ماہ نخشب تمام ہوا۔ اور چاہ نخشب سے

نکل نہ سکا۔ تو خلیفہ کا سپہ سالار یہی تو قلمش تھا۔ جب تو قلمش نے نخشب کے حصار میں رخنہ کیا، اور اندر گھس آیا تو اس نے نقاب پوش پیکر دیکھا۔ جانا کہ یہی مقنع ہے، یہی ساحر نخشب ہے، یہی جادوگر نخشب ہے، یہی کیمیا گر ہے، یہی انسانوں کی جان اور ایمان کا دشمن ہے اس نے کمان کڑی کی تیر چلایا۔ اور نقاب پوش پیکر زمین پر گرا۔ تو قلمش نے جھپٹ کر اس کی نقاب اتاری۔ یہ مقنع نہ تھا۔ یہ اس کی اپنی کنیز تھی، اپنی مطلوبہ اپنی محبوبہ تھی یہ اس کی نائلہ تھی۔

"اے امیر تو قلمش نے اپنے بال نوچے، اپنی زرہ اتار پھینکی اور بین کرنا شروع کیا کہ ہائے یہ میں نے کیا کیا۔

نائلہ نے اس سے کہا: "اے میرے مطلوب سُن، اے میرے محبوب سُن حُسن جب ظالم کے قبضے میں آتا ہے، تو حُسن نہیں رہتا، عاشق کے کام کا نہیں رہتا..... جہاں ظالم ہے وہاں جمال جمال نہیں، کمال کمال نہیں، وصال وصال نہیں۔ اس لئے اے محبوب میں جو ہمیشہ تیری ہوں، تیری نہیں ہو سکتی۔ لیکن تیرے ہاتھوں مرنے میں جو لذت ہے وہ تیرے ساتھ زندگی بسر کرنے میں نہیں۔"

"اور جب امیر المومنین مہدی نے اس مجبور عاشق، اور اس مجروح معشوقہ کو دیکھا، تو اے امیر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے پوچھا: اے کنیز باوفا یہ بتا کہ مقنع کہاں گیا؟"

"کنیز نے کہا: اے امیر المومنین ماہ نخشب میں تیزاب بھرا تھا، اسی تیزاب کا ایک گولہ چاند بن کر ہر شام طلوع ہوتا تھا۔ جب نخشب کا حصار ٹوٹا تو مقنع اس تیزاب کے کنویں میں کود کر ڈوب گیا، اس کی ہڈی ہڈی گل گئی ہوگی..... اے مہدی دیں پناہ دجال جو سارے عالم کے

لئے وبال ہوتا ہے۔ اس کا یہی حشر ہوتا ہے۔ رہ گیا میرا محبوب قوقلش تو یہ اپنی اپنی قسمت ہے۔ اپنا اپنا نصیب ہے۔ کسی کا نصیب رنج گنج شائیگاں کسی کا نصیب گنج رنج رائیگاں۔۔۔۔۔"

راوی کی بے بصر آنکھوں نے پھر امیر صاحب قراں کی طرف اس طرح دیکھا گویا وہ خدانخواستہ، خدانخواستہ مقنع کو ان سے تشبیہہ دے رہا ہے۔ میرا ہاتھ پھر تلوار کے قبضے پر پڑا۔ امیر صاحب قراں نے مجھے پھر اشارے سے روکا کہ اتنے میں ایک سیاہ پوش سوار، گرد سے اٹا ہوا، گھوڑے سے اُترا، اور سر بہ سجدہ ہو کے عرض کرنے لگا۔

"میں شہر سبز سے ایک منحوس خبر لایا ہوں، اگر جان کی اماں پاؤں تو عرض کروں۔"

ہم سب کا دل بیٹھنے لگا۔ امیر گورگاں نے اجازت دی اور قاصد نے اپنا عمامہ اتار کے امیر کے قدموں پر ڈال دیا، اپنے بال نوچے اور عرض کی۔

"شہر سبز میں اولجائی تُرکان آغا بیمار تھی۔۔۔۔۔ اس کا انتقال ہو گیا۔"

امیر تیمور پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ بدنہاد راوی بول اُٹھا: "اپنا اپنا نصیب کسی کا نصیب رنج گنج شائیگاں کسی کا نصیب گنج رنج رائیگاں۔"

۱۴

آج فتح حلب سے پہلے .....

لیکن الیاس خواجہ اوغلان کی یورش کے بہت بعد، حاجی برلاس اور بایزید جلائر کی موت کے بعد، اس تخلستان میں سلطان حسین اور ولشاد آغا سے اچانک ملاقات کے بعد، خوارزمیوں کی غداری اور تعاقب کے بعد، علی بیگ کی قید کے بعد، ویران اندھے کنویں میں اولجائی ترکان آغا کے اتارے جانے کے بعد، خدنگ جستہ سے لنگ آنے کے بعد، قرشی کی لڑائی اور فتح کے بعد.... اور ماہ نخشب کے افسانہ کے صدیوں بعد، اولجائی ترکان آغا کی موت کے بعد....

ویران مینار کی سیڑھیوں پر جس شکست خوردہ تاجدار کو انجام کا انتظار تھا، وہ اسیر تھا۔ اور رات کے آخری تارے گن رہا تھا۔ آج کی رات ساری بوغلانے تاروں کی چھاؤں میں نہیں گذاری تھی۔ اور آج وہ الماليك سے سمرقند تک تنہا سفر نہیں کر رہا تھا۔ اُردو میں اس کا پستہ قد ٹٹو اطمینان سے اس کے

خیمے کے پاس بندھا بھیگا ہوا چنا کھا رہا تھا۔ اولجائی ترکان آغا دورِ شہر سبز میں، آق سرائے کے ہرے بھرے باغ میں صنوبروں کے گھنے سائے میں زمین کے نیچے آرام کی دائمی نیند سو رہی تھی۔ آج ڈوبتی ہوئی رات کو چیر چیر کر آنے والے دن کی آوازیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ کتوں کے بھونکنے اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ یاد کی بساط پر پٹے ہوئے مہروں کی بازی ختم ہو چکی تھی، اور اب صرف ایک سوال تھا جس کا جواب دینا تھا۔ قاضی زین الدین کا سوال۔ جبر یا عدل۔ جبر یا عدل۔

کیونکہ پٹے ہوئے مہروں نے گواہی دی تھی کہ سلطان حسین اس کا رفیق بھی تھا۔ عزیز بھی تھا۔ دونوں نے ساتھ مل کے مغلوں کا مقابلہ کیا۔ سلطان حسین جو جلائر تھا، تاجدار تھا، اب تاج چھوڑ کر خانۂ کعبہ ہجرت کے لئے جانا چاہتا تھا لیکن اس کا یقین تھا کہ پھر یورش کرے گا۔ پھر غداری ہو گی۔ پھر حقیر اور بیچارہ دشمن خروج کرے گا.....

یہاں تک تو عقل نے راستہ دکھایا۔ اور اس کے بعد تیمور نے قالین پر لیٹے لیٹے گاؤ تکیہ کے سہارے اپنی لنگڑی ٹانگ پھیلائی۔

اس جنگل میں کوئی کسی کا بھائی نہیں تھا۔ کوئی کسی کا عزیز نہیں تھا۔ کیا کہا تھا قاضی زین الدین نے کہ عدل میں سازش کا مقام نہیں.....

تیمور کی پیشانی کی تینوں لکیریں گہری ہوئیں، پھر اس نے آہستہ آہستہ بے آواز قہقہہ لگایا اور نقیب کو حکم دیا کہ بلخ کے امیر کیخسرو کو اس کے خیمے سے جگا کے بلا لائے۔

اور اس سے تیمور نے کہا: میں تمھیں کوئی حکم نہیں دیتا۔ نہ قصاص کا نہ خون بہا کا۔ میں اس مقدمہ کا کوئی تصفیہ نہ کروں گا۔ اس کا تصفیہ میرا نہیں

تمہارا معاملہ ہے ....."

امیر تیمور کی آنکھ میں ایک چھوٹی سی چمک پیدا ہوئی، جسے دیکھ کر کیخسرو کی دونوں آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے امیر کے لبادۂ شب خوابی کا دامن چوما، اور پھرتی سے خیمے کے باہر نکل گیا۔

بابا زین الدین نے تہجد کی نماز سے منھ پھیرا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ یہ کیخسرو تھا جو تیزی سے تیمور کے خیمے کی طرف جا رہا تھا، اس کے ہاتھ میں سلطان حسین کا کٹا ہوا سر تھا۔ وہ اسے اس طرح اٹھائے ہوئے تھا کہ داڑھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس بے حرمتی سے تو کٹے ہوئے دُنبے کا سر کوئی قصائی بھی نہیں اٹھاتا۔

قاضی زین الدین نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا ——— اور خدا سے ساری دنیا کے لئے دعا مانگی۔ ان شہروں کے لئے جنھیں اب تک مسمار نہیں کیا گیا تھا، ان شہریوں کے لئے جن کا قتل عام نہیں ہوا تھا۔ اُن عورتوں کے لئے جن کی عصمت دنیا بھر کے مکانوں میں محفوظ تھی، ان بچوں کے لئے جو یتیم نہیں ہوئے تھے، اور غلام نہیں بنے تھے۔ اور جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو کوئی اس کے دل سے چپکے چپکے کہہ رہا تھا یہ سب بیکار ہے، یہ سب بیکار ہے۔

کیوں کہ وہ دونوں آنکھیں آہن پوش ہو چکی ہیں۔

"آپ کا اپنا ذاتی لائبریریوں کو اچھی اچھی کتابوں سے پُر رکھنا
اپنی جیبوں کو پیسوں سے بھرا پرا رکھنے کے مقابلے میں کہیں
زیادہ عزت و احترام کے قابل ہے۔"

جان للی

آئندہ پروگرام

۱۔ اردو اور افغان (لسانیات) مولانا عرشی
۲۔ ترجمہ مجالس رنگین (ادبی حکایات) مترجمہ "
۳۔ اردو داستانیں تاریخ و تجزیہ رازیزدانی
۴۔ رام پور کا ماحول شعر و سخن "
۵۔ مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی
۶۔ ٹیڑھی لکیر (ناول) عصمت چغتائی
۷۔ انتخاب طلسم ہوشربا محمد حسن عسکری
۸۔ خوشنویسی کی تاریخ مولانا عرشی

کتاب کار (پبلیکیشنز) رام پور، یو۔پی

Nigar, Jan-Feb 66. Regd. No. L 466
Registered with the Registrar of News Papers at R. N. No. 2136/5

ضروری: کیا

آپ کا نام اور پتہ ہمارے پاس نوٹ ہے؟
اگر نہیں تو ——

۱ ہمیں اپنے پتے سے آگاہ کیجئے تاکہ ہم آپ کے مذاق کی شائع ہونے والی ہر نئی کتاب کی اطلاع آپ کو دے سکیں۔

۲ اپنے اُن دوستوں اور ایسے اداروں کے نام اور پتے بھی تجویز کیجئے جن سے معیاری کتابوں کی خریداری متوقع ہو۔

کتاب کار : رامپور، یوپی

Printed at :- Delhi Printing Press, Rampur.
Editor, Publisher, A. A. Abroo

نہ کہیں اس کا گھوڑا نظر آ ہی جائے گا۔ کیونکہ بیوقوف گھوڑا المالیک تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس کے بغیر اس کے گھوڑے کا وجود بھی تو نامکمل تھا۔ کیونکہ وہ اس کا دماغ تھا، وہ وہ ہاتھ تھا جو اس گھوڑے کو سوکھی ہوئی گھانس اور مشکیزے کا پانی دیتا۔ اور اس ریگستان میں نہ کہیں ہری گھانس تھی اور نہ چشمے کا پانی۔

مینار کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا، تو یہ کافی اونچا تھا۔ پتھروں کا رنگ ریت کے پڑوس میں اور زیادہ ریتیلا ہو چکا تھا، اور ان میں کہیں کہیں سرخی جھلک رہی تھی۔ زینے پر چڑھنے سے پہلے اس نے صدا لگائی "او۔ او۔ او۔"

اور اس کی اپنی ہی آواز گونج کر واپس آئی۔ اس کی تلوار کی نیام پتھروں سے ٹکرائی اور اس کے چمڑے کے جوتوں کی چرچر کی آواز سے بھی گونج سی پیدا ہوئی۔ اس نے کھنکھارا اور کھنکھارنے کی آواز بھی مینار کی سیڑھیوں پر گونج اٹھی۔ ساری بوغا بہادر تھا، لیکن انسانوں کے مقابل غول بیابانی کے متعلق اس نے بہت سے قصے سمرقند میں سنے تھے اور بڑے معتبر لوگوں کی زبانی۔ مثلاً جلال الدین گیلانی نے ایک بڑے مناظرے میں جنات، غول بیابانی اور ارواح خبیثہ کا وجود ثابت کیا تھا اور ساری بوغا کا عقیدہ ذرا ذرا کچا کچا تھا کہ یہ ساری غیر مرئی اور شیطانی مخلوق شاید ہو شاید نہ ہو۔

معلوم نہیں اسے غول بیابانی کا خیال پہلے آیا، یا وہ آواز پہلے سنائی دی یا دونوں ایک ساتھ مگر یہ ایک نئی طرح کی آواز تھی۔ کسی اور کے چمڑے کے جوتوں کی چرچر کی گونج، پتھروں سے کسی اور کی تلوار کے میان کے کھڑکھڑانے کی آواز اور پھر ایک صدائے بازگشت۔

اس نے فوراً لاحول ولا قوۃ پڑھا۔ اور بہادری سے دل میں سوچا کہ اب تک آدمیوں سے لڑتا رہا ہوں۔ اب غول بیابانی سے بھی مقابلہ سہی۔ لاحول ولا

توق کے ساتھ ہی ساتھ اس نے منہ کے گرکر تینگری،نیلمیں جاودانی آسمان کو یاد کیا کیونکہ اور چغتائی مغلوں کی طرح اس کا عقیدہ کچا تھا کبھی وہ خدائے واحد القہار سے مراد مانگتا اور کبھی جاودانی آسمان سے۔ کبھی ایک پر ایمان لے آتا اور کبھی اپنے دل کی گہرائیوں میں دوسرے کی حکومت محسوس کرتا اور کبھی کبھی سوچتا کہ دونوں ایک ہی ہیں۔

اس نے وحشیانہ مغل انداز میں پھر نعرہ لگایا: "کون ہے؟۔۔۔اُو۔۔۔اُو۔۔۔۔۔اُو"

وہ جو اوپر کی چھپی ہوئی چکردار سیڑھیوں پر آگے آگے اوپر چڑھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے رُکا۔ اور پھر چرمی جوتوں کے چُرمُر کی گونج بڑھ گئی۔

ساری بوغا نے تلوار کھینچ لی "یہ جن نہیں انسان ہے۔ میری آواز سن کے اوپر بھاگ رہا ہے" اور اس نے جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگ کے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ اب اوپر اوپر جو آدمی چڑھ رہا تھا۔ اس کی شکل اسے اپنے سے بہت قریب نظر آئی۔ اس نے بھی تلوار کھینچ رکھی تھی اور ساری بوغا کو اوپر چڑھتا دیکھ کر وہ ایک لحظہ کے لیے ٹھٹکا اور تلوار سونتی۔ بے اختیار ساری بوغا کی زبان سے حیرت کے عالم میں نکل گیا۔

"سلطان حسین"

سلطان حسین کا بھاری بھرکم جسم اس سے صرف چند سیڑھیوں اوپر تھا، اس کی گھنی داڑھی کے ملگجے بالوں پر گرد تھی، وہ منہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا، اس کی سفید چوڑی پیشانی کے نیچے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مایوسی اور اندوہ سے اپنی چمک کھو چکی تھیں۔ اس کا وقار اب بھی شاہانہ تھا۔ اور اس کی تلوار کی دھار تیز تھی۔

سلطان حسین نے ساری بوغا کی چھوٹی چھوٹی منگول آنکھوں میں مکاری اور چالاکی کی چمک پڑھ لی۔

اس نے پھر اپنا سوال دہرایا "تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"میں الماليک سے سمرقند جا رہا تھا۔ اکیلا۔ خداوندِ یہ بھی کوئی زندگی ہے برفستانوں اور ریگستانوں میں اکیلے ایلچی اور جاسوس کی زندگی مگر آپ کی خدمت میرا فرض ہے۔ میں ہر خدمت کے لیئے تیار رہوں میں الماليک سے ختن گیا۔ مغلستان کی سرحدوں تک گیا اور مجھے چغتائیوں کے سب حالات معلوم ہیں.... میں الماليک سے سمرقند واپس جا رہا تھا کہ میرا گھوڑا رات کو کھو گیا۔ وحشی گھوڑا تھا۔ چھوٹا سا منگول ٹٹو، مگر اپنے آپ کو شاید عرب شبدیز سمجھتا ہے، یا سمجھتا ہے کہ میں من کے کو کو تینگری کے علاوہ کسی اور کی سواری کے قابل نہیں۔ رات کو میں نے اسے کھلایا پلایا صبح کو دیکھا تو غائب۔ خداوند میں نے بلی کی بے وفائی کے قصے سنے ہیں عورت کی بے وفائی کے قصے سنے ہیں۔ بھائی بھائی کی بے وفائی کے قصے سنے ہیں، لیکن کتے یا گھوڑے کو نسبے وفا دیکھا تھا نہ سنا تھا اور جو نہ دیکھا تھا اور نہ سنا تھا وہ مجھ پر گذر گئی۔ میں نے دور سے یہ مینار دیکھا اور سوچا کہ اس پر چڑھ کے ادھر اُدھر نظر دوڑاؤں۔ یہاں آیا تو خداوند کی قدم بوسی نصیب ہوئی۔ مگر حضور یہاں اکیلے کیسے؟"

"تو نے واقعات کا احوال نہیں سنا؟" سلطان حسین نے شک کے لہجے میں پوچھا۔

"حضورِ والا کونسے واقعات؟"

"میری اور امیر تیمور گورگاں کی لڑائی۔ اس لنگر کے آگے میری

تقدیر میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ میرے خیال میں تو اسی کا بھیجا ہوا جاسوس ہے۔"

سارہی بوغا ایک لحظے کے لئے ہچکچایا کہ اپنی تلوار سلطان حسین کے سینے میں گھونپ دے یا اس کے قدموں پر ڈال دے لیکن اس کی اپنی گردن کے قریب سلطان حسین کی تلوار کی نوک تھی۔ اس نے الما لیک میں تیمور اور سلطان حسین کی لڑائی کی خبریں خوب سُنی تھیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ نکلتے ہوئے سورج کا ساتھ اچھا ہے۔ ڈوبتے ہوئے چاند کا کیا ساتھ۔ اُس کے چہرے پر یکلخت کرختگی پیدا ہوئی یہ خواہش کہ ایک وحشیانہ وار میں یہ تلوار سلطان حسین کے ہاتھ سے گرا دے۔

اور اس کی آنکھیں سلطان حسین کی سرد منجمد آنکھوں سے دوچار ہوئیں۔ تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے خیالات سلطان حسین پر آئینے کی طرح روشن ہیں۔

اس نے ایک لحظے کے اندر اندر تصفیہ کیا اور اپنی تلوار سلطان حسین کے قدموں پر ڈال دی اور گردن جھکا دی۔

"خداوند میں مغل ہوں۔ اور آپ جلائر مغل سلطان ہیں۔ آپ کی رگوں میں خان اعظم چنگیز خاں اور ایلخاں ہلاکو خاں کا لہو ہے۔ یاسائے چنگیزی نے مجھے آپ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ میں آپ سے غداری کر کے تیمور لنگ کا ساتھ کیسے دے سکتا ہوں، جو گورگان ہے، جو چنگیز کے خانوادے کا داماد ہے اور یہ بھی تو آپ ہی کے رشتے سے۔ میں من کے کوکو تینگری کی، یاسائے چنگیزی کی قسم کھاتا ہوں کہ میں آپ ہی کا نوکر ہوں۔"

یہ کہہ کر سارہی بوغا نے اوپر کی سیڑھیوں پر سلطان حسین کے قدموں کے قریب اپنا سر رکھ دیا۔

سلطان حسین کے ہونٹ لرزنے لگے۔ اس کے ہاتھ کپکپائے۔ شک ایک لمحہ کے لئے چمکا اور غائب ہو گیا۔ پھر یہ کہ شک سے فائدہ ہی کیا تھا اب شہ مات کے وقت دیر کیا سویر کیا۔ فرزیں نہیں، رخ نہیں، سپاہ نہیں، ایک مغل اسپ بلا پیلانہ ملانہ ملا سلطان حسین کی گھنی پلکوں پر ایک نمکین ستارہ جھلکا۔ اس نے اپنی میلی خورجی سے مروارید کا ایک ہار نکالا اور ساری بو غا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ "اس وقت میرے پاس کچھ نہیں، تو جا اپنا راستہ لے، اور کسی سے اس کا ذکر نہ کر کہ تو نے مجھے یہاں دیکھا ہے۔ میں نے اوپر سے تیرے گھوڑے کو دیکھ لیا ہے، شمال مشرق میں اس لنگوار ٹیلے کے اُس پار ایک نخلستان ہے جہاں تیرا ٹٹو گھانس چر رہا ہے۔"

ساری بو غا خوشی سے چیخ پڑا۔

سلطان حسین نے پھر اسی وقار سے دہرا کر کہا۔ "جا اور اپنا راستہ لے۔"

سلطان حسین کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ ساری بو غا نے اس کی طرف دیکھا اور اب وہ ایک نظر میں بھانپ گیا کہ ہارا ہوا شہر یار کئی روز سے بھوکا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ وہ دیوار کے سہارے اپنا وزنی بوجھ سنبھالے تھا، لیکن اب بھی اس کا ہاتھ تلوار کو مضبوطی سے تھامے تھا۔ اور ساری بو غا کو مجال نہ ہو سکی کہ اپنی نثار کی ہوئی تلوار پھر سے اٹھا لے اور وہیں غداری کا وار کرے۔ اس نے نظر اٹھا کے سلطان حسین کی طرف دیکھا، اس کے سارے خیالات پھر سلطان حسین پر آئینے کی طرح آشکارا تھے، گویا سلطان کی آنکھیں اس کی غداری کو سمجھ بھی رہی تھیں اور معاف بھی کر رہی تھیں۔ اس نے پھر سلطان کے قدموں پر سر رکھ دیا اور رونے لگا۔ "میرے آقا نے مجھ پر رحم کیا میری جان بخشی

کی۔ مجھے مرداریدکا ہار دیا، اور میں نے اپنے آباد و اجداد سے وفاداری نہ سیکھی۔ میرے آباد و اجداد نے چغتائی خاں کے ساتھ ختن فتح کیا۔ اور میں آج حضور کے کام نہ آسکا۔ اب مجھے جاں نثاری کی اجازت مرحمت ہو۔ اس وقت میرے مشکیزے میں گندے پانی کے سوا کچھ نہیں۔ میں نخلستان سے اپنے ٹٹو کو لے کے کسی قریب کی ترکمان خیمہ گاہ تک جاؤں اور وہاں سے اپنے آقا کے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ لیتا آؤں"۔

سلطان حسین نے اسے اٹھنے کا حکم دیا۔ لیکن اس کی تلوار اس کے حوالے نہیں کی۔ یہ حفاظت کی آخری کوشش تھی۔ لیکن اسے قتل بھی نہیں کیا۔ شاید اس کے دل میں وفا کی شمع روشن ہو۔ شاید وہ پہلا منگولی اسپ ہو اور شطرنج کے سب مہرے اسی کے ذریعہ فراہم ہوں۔ اور شاید تقدیر کا بھی یہی منشا ہو۔ اس سے پہلے بھی کئی بار یہی ہو چکا ہے کہ دوست نے دشمنی کی اور دشمن نے دوستی۔ غدار نے جان بچائی۔ اور جاں نثار نے غداری کی۔ سلطان حسین نے اسے اٹھنے کا حکم دیا۔ اور کہا "یا تو اپنا راستہ لے۔ یا اگر تو سچا ہے تو دن کو ادھر کا رخ نہ کرنا۔ رات کو اگر کچھ کھانے کے لئے لا سکتا ہے تو لے آ"۔

یہ کہہ کے سلطان حسین نے اسے شک کی نظروں سے دیکھا۔ مگر اب اس منگول سردار کے چہرے پر کہیں مکاری اور چالاکی کے آثار نہ تھے۔ اس نے سلطان حسین کے ہاتھ چومے۔ اپنی تلوار وہیں اس کے قدموں پر پڑی رہنے دی اور با ادب سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ اور مینار سے باہر جانے سے پہلے ایک بار پھر اس نے سر بہ سجدہ ہو کے سلام کیا اور کہا کہ "یہ جاں نثار اندھیرا ہوتے ہی اپنے آقا کے لئے کھانے کا سامان کہیں نہ کہیں سے

لیتا آئے گا۔"

سلطان حسین اسی طرح دیوار کا سہارا لیے کھڑا رہا، مگر اسے بھوک سے چکر آرہا تھا۔ جب ساری بوغا مینار سے باہر غائب ہو چکا تو سلطان حسین نے مینار پر سے چڑھ کے دیکھا۔ نخلستان میں اپنا ٹٹو دیکھ کے ساری بوغا اس اشتیاق سے اس کی طرف دوڑا کہ اس عالم میں بھی سلطان حسین کو ہنسی آگئی اور اسے پھر ذرا اطمینان ہوا کہ ساری بوغا نے [illegible] کا رُخ نہیں کیا بلکہ وہ جنوب میں اس طرف روانہ ہوا جہاں ترکمانوں کے خیمے تھے۔ اس کے باوجود سلطان حسین کو ساری بوغا کی غداری کا اندیشہ برابر کھٹکتا جاتا تھا۔ اس کے دل میں یہ بھی آئی کہ شام ہوتے ہی اس ویران مینار سے اور کہیں بھاگ نکلے، لیکن پھر بھوک پیٹ میں اژدھے کی طرح پھنکارے مارنے لگی، اور سلطان حسین نے اپنے دل میں کہا کہ یہ گدھ جو دن بھر مینار پر میرے انتظار میں منڈلاتا رہا مجھے کتنی دور اڑ جانے دیگا۔ اور وہ تقریباً نیم غشی کے عالم میں

سب کچھ مہنگا ہو گیا مگر کتابیں سستی ہو گئیں

جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں

ناولٹ

عزیز احمد

کتاب کار (پبلیکیشنز) رام پور یو پی

۳

اور جب اندھیرے میں اس نے سیڑھیوں پر اور اپنے اطراف قدموں کی چاپ سنی تو وہ لمحہ بھر میں سمجھ گیا کہ یہ ساری بوغا اکیلا نہیں۔ ایک پورا دستہ کا دستہ اس کے ساتھ ہے اور یہ دستہ وفاداروں کا نہیں۔ اور اس نے ساری بوغا کی مکار آواز سنی جو تاریکی میں استہزا بکھیر رہی تھی "ہم حضور کے جاں نثار خادم ہیں۔ لیکن اب حضور کی مزاحمت بیکار ہے۔"

سلطان حسین نقاہت کے عالم میں تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا، اس کا تن ہلکے ہلکے بخار سے اور اس کا من ایک طرح کی بے بسی سے جل رہا تھا۔ مگر اس نے پورے شاہانہ دبدبہ کے ساتھ کہا "مجھے اپنے امیر کے پاس لے چلو۔"

تیمور کے خیمے میں ہر چیز سلطان حسین کی جانی پہچانی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ شکل بھی جو نچلے سے حاشیہ دار تخت پر آہنی خود پہنے براجمان تھی، اور جس کی ایک ٹانگ آگے کی طرف پھیلی ہوئی تھی۔

تیمور نے سلطان حسین کی طرف ایسی آنکھوں سے دیکھا جو گویا شیشے کی بنی ہوئی تھیں۔ جن میں جذبہ ندارد تھا اس کے چہرے پر نہ خوشی تھی نہ رحم نہ خشونت۔ ایک خشکی تھی جس میں جذبات کا قطعاً وجود نہ تھا۔ اور اس نے سلطان حسین کو عزت سے بٹھانے کا حکم دیا۔

پھر اس نے اپنے اس رقیب، اس عزیز کی طرف دیکھا جو اولجائی کا کا بھائی تھا۔ اور اولجائی اسے یاد آگئی اب وہ شہر سبز کے ایک سرسبز و شاداب باغیں باغ میں سرو کے ایک نوخیز پودے کے سائے میں ازلی ابدی نیند سو رہی تھی۔ اس کی اولجائی جس کے حسین، گداز جسم سے ایسی زندگی ٹپکتی تھی کہ وہ ہر لمحے جھانکتی ہوئی، بھیانک دانت دکھاتی ہوئی موت کو بھول جاتا جو ہر زاویے، ہر گوشے سے اس سے آنکھ مچولی کھیلتی۔ اور جب تیمور کو اولجائی یاد آئی تو اس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکلے، لیکن ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے اوپر سے نیچے تک اس کے دل کو کسی بڑھئی کے آرے سے چیر دیا ہے۔ جیسے یہ زخم جسے کسی انسان کے ہاتھ نہیں لگایا تھا، شہر سبز کی طرح ہمیشہ ہرا رہے گا۔

سلطان حسین میں اولجائی سے ذرا سی مشابہت تھی، وہی کشادہ پیشانی وہی ذرا ذرا پھیلی ہوئی ناک اور پھڑکتے ہوئے نتھنے۔ اور تیمور نے ایک جذبہ سا محسوس کیا کہ وہ اٹھ کر اپنے اس خون کے پیاسے دشمن سے بغل گیر ہو جو اس کی محبوبہ کا بھائی تھا لیکن سنگین آنکھیں، فولادی اعصاب پھر سنگ و آہن کے ہو گئے۔ اولجائی کو سلطان حسین کے ہاتھوں کونسی راحت ملی تھی کیا اس نے اولجائی کا ایک ایک محبوب زیور اپنے ہاتھ سے اتار کے سلطان حسین کو بطور محصول کے نہیں دیا تھا۔ اور یہ جان کر بھی کہ یہ زیور بہن کا ہے سلطان حسین نے اس خراج کو قبول نہیں کیا تھا؟ کیا اولجائی کی زندگی میں بھی وہ اس کے

خون کا پیاسا نہیں رہا تھا۔

اس جنگل میں کوئی کسی کا بھائی نہیں تھا۔ کوئی کسی کا عزیز نہیں تھا۔ یہاں شیر تھے، چیتے تھے اور ان کے ساتھ بہت سے جنگلی جانور لگے ہوئے تھے۔ کچھ شغال کچھ بھیڑیے، کچھ خرگوش۔ یہاں کون کس کا تھا؟ یہاں نری موت تھی۔

پہلا فرض مہمان نوازی تھا۔ سلطان حسین کے ہاتھ دھلائے گئے اور اس کے آگے دستر خوان بچھایا گیا۔ تیتروں کی یخنی، شیشش کوفتہ اور پتلی پتلی ترکمانی نانوں کی رکابیاں اس کے آگے سجائی گئیں۔ تیمور کو معلوم تھا کہ سلطان حسین کو تورانی کومیس پسند نہیں۔ ہراتی انگوروں کی کشید کی ہوئی شراب کا ساغر اور اس کے ساتھ کاشان کا منقش طلائی جام اس کے آگے رکھا گیا۔ اس کا اپنا بھانجا اور تیمور کا سب سے بڑا بیٹا جہانگیر اس کے سامنے، تیمور کے اشارے پر دو زانو ہو بیٹھا۔ سلطان حسین کئی دن کا بھوکا تھا، لیکن اس کے چہرے یا اس کے شاہانہ انداز استغنا سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی اتنا کھا پی چکا ہے کہ اب صرف اپنے میزبان کی خاطر سے دوبارہ کھانے پر آمادہ ہوا ہے۔

کھانے کے درمیان میں فراست اور خالص ترین شر کی ایک جھلک تیمور کے چہرے پر نمودار ہوئی اس کے ابرو اور گھنے ہوئے اور اس کی پیشانی پر تین لکیریں نمودار ہوئیں۔ اور اس نے تین مرتبہ تالی بجائی۔ اس سہ بارہ تالی کا مطلب سب کو معلوم تھا، ایک زرد رو و لاغر اندام شخص پردے کے پیچھے سے نمودار ہوا وہ چینی اطلس کا لبادہ پہنے تھا، اور اس کی تلوار کی میان طلائی تھی۔ وہ سر سے پیر تک بجائے زرہ بکتر اور جوشن کے محبوب خواجہ سراؤں اور غلمانوں کی طرح جواہرات پہنے تھا۔ اس کے کان چھدے ہوئے تھے، اور اس کے گلے میں مروارید کے ہار پڑے تھے۔ لیکن اس کے سر پر مغلوں کا چنگیز خانی تاج تھا۔

تیمور کے ہونٹوں پر ایک طرح کی خبیث شیطانی مسکراہٹ جھلکنے لگی اور اس کا اشارہ پاتے ہی تیمور کی اپنی اولاد کے سوا جتنے درباری اور سپہ سالار تھے وہ سب جھک کر آداب بجا لائے ۔ اور تیمور نے اس چینی اطلس کے لبادے کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

سلطان حسین نے یہ سب کن انکھیوں سے دیکھا' اور نفاست اور بے نیازی سے نان اور شیش کوفتہ کا ایک بڑا سا لقمہ اپنے منھ میں رکھا اور پھر بھری شراب کا جام اپنے منھ سے لگا لیا۔

اب تیمور نے اس سے کہا: "برادر عزیز سلطان حسین جب آپ ہم سے جدا ہو گئے ۔ اور آپ نے مجھ سے مقابلہ اور میرے خلاف صف آرائی میں مصلحت جانی تو میں نے سیور غاتمش کو جو خان اعظم چنگیز خاں کی نسل سے ہے اور جس طرح آپ ایلخانی شاخ کے چشم و چراغ ہیں' اسی طرح اس کا تعلق چغتائی شاخ سے ہے' ماورالنہر سمرقند اور تاتار کا بادشاہ مقرر کیا۔ کیونکہ بادشاہ کا خان اعظم چنگیز خاں کی نسل سے ہونا ضروری ہے۔"

سلطان حسین نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جہانگیر نے اپنے باپ کی طرف نیچی نظر سے ایک بار دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ خدام نے آگے بڑھ کے سلطان حسین کے آگے سلفچی رکھدی' اور اس کا ہاتھ دھلانے لگے ۔ سلطان حسین نے منھ میں انگلی ڈال کے دانت صاف کئے' اور کلی کی۔ خدام نے ترکی طوال اور کنگھا پیش کیا۔ سلطان حسین نے طوال سے منھ صاف کیا' اور اپنی گھنی داڑھی میں کنگھی کی۔ دسترخوان بڑھایا جانے لگا۔ اور اس وقت دانتوں میں طلائی خلال کرتے کرتے، سلطان حسین تیمور کی طرف متوجہ ہوا۔ سیور غاتمش پر اس نے حقارت اور رعونت کی نظر ڈالی اور تیمور سے کہا: "برادر عزیز امیر تیمور گورگان

تعز من تشاء وتذل من تشاء"

قاضی زین الدین نے تسبیح پڑھتے پڑھتے گردن جھکالی۔ تسبیح ختم کر کے اس نے گہری سانس لی۔ اور تیمور کی طرف لجاجت کی نظر سے دیکھا۔ گویا وہ سلطان حسین کی سفارش کر رہا ہے۔ پھر ہمت کر کے اس نے ہاتھ جوڑے اور کہا:

"اگر اس بوڑھی بے مصرف جان کو امان ملے تو کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں۔"

تیمور نے اس کی طرف دیکھا۔ یہ گویا اس کے اپنے ضمیر کی آواز تھی۔ "زین الدین بابا آپ کا ارشاد میرے سر آنکھوں پر۔"

زین الدین نے کہا: "امیر تیمور صاحب قراں، اللہ تعالیٰ کی مصلحتیں عظیم ہیں، اور عجیب و غریب ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو عزت اور توقیر بخشی"۔.....

تیمور کے چہرے پر بے صبری کی لہر دیکھ کر اس نے کہا: "اس کے فیض سے آپ کے بازو کو وہ قوت عطا ہوئی کہ آپ نے چغتائی مغلوں کا قلع قمع کیا، ماوراالنہر اور سمرقند کو کفار سے پاک کیا۔ اپنے اور تمام حریفوں کو شکست دی، اور بجا طور پر آپ نے اپنے لئے امیر صاحب قراں کا لقب انتخاب فرمایا۔ آپ نے قرآن کے ساتھ یاسائے چنگیزی کی بھی پابندی کی۔ آپ نے تاج کو ٹھکرایا، اور اپنی ایک ٹھوکر سے امیر سیور غامش کو تاجدار بنا دیا۔ آج آپ کا حریف اور برادر نسبتی سلطان حسین آپ کے دربار میں اسیر ہو کر آیا ہے۔ یا امیر صاحب قراں یہ فیاضی کا وقت ہے ....."؟ زین الدین کی آواز میں اب خوشامد یا مصلحت کا اثر باقی نہ رہا اور اس نے کڑک کر کہا: "یہ جاں بخشی اور فراخ دلی کا موقع ہے سلطان حسین آپ کا بھائی ہے۔ آپ کی مرحوم اہلیہ جنت مکانی اولجائی

خاتون آغا کا بھائی ہے۔ اس بوڑھے کی سفید داڑھی کی لاج رکھیے۔ آپ دونوں میری دونوں آنکھوں کا نور ہیں۔ آپ سلطان حسین کی خطا سے درگذر کیجئے۔ اور اولجائی خاتون آغا کی محبت اور ان کی یاد کے واسطے سے۔۔۔"

تیمور نے دیکھا کہ جہانگیر کی گردن جھک گئی ہے، اور اس کی پلکوں پر ذرا سی نمی پیدا ہو چلی ہے۔

تیمور نے کرخت آواز لیکن بڑے ادب کے لہجے میں کہا: "بابا زین الدین مجھے ایک لمحے کے لئے معاف فرمائیں۔ میں ساری بوغا سے ایک سوال پوچھ لوں۔"

جہانگیر پر نظر گاڑ کے تیمور نے ساری بوغا سے پوچھا۔

"ساری بوغا مروارید کا جو ہار تمھیں سلطان حسین نے دیا، تمھارے پاس ہے؟"

ساری بوغا نے دوزانو ہو کر وہ ہار اپنی خورجی سے نکالا اور تیمور کی خدمت میں پیش کر دیا۔

تیمور نے کہا: "ساری بوغا اس کے بدلے اس کی جوہری قیمت کے جواہر تمھیں ملیں گے۔ میں نے تمھیں تمھاری وفاداری کے صلے میں منگ باشی مقرر کیا۔" اور پھر تیمور نے جہانگیر پر شفقت کی ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کے اسی طرح بیٹھے بیٹھے اپنی گردن سلطان حسین کی طرف پھیری اور اس طرح کہا جیسے کوئی اپنے آپ سے کوئی راز کی بات کہے: "یہ ہار اولجائی خاتون آغا کا تھا۔"

دفعتاً کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ زین الدین کی زبان بند ہو گئی۔ جہانگیر کی پلکیں خشک ہو گئیں۔ ایلچی بہادر کے چہرے کے اعصاب سخت ہو گئے ساری بوغا کی منگول مونچھوں کے نیچے ایک وحشی سی مسکراہٹ ایک کان سے دوسرے

کان تک پھیل گئی ـــــ اور سلطان حسین نے سر جھکا لیا، اور لمحہ بھر بعد جب کنکھیوں سے تیمور کی طرف دیکھا تو معلوم ہوتا تھا کہ تیمور کی آنکھیں زرد ہو چکی ہیں۔ جیسے اسے یکلخت یرقان ہو گیا ہو۔

اور تیمور نے آہستہ آہستہ کہا: "سلطان حسین، خدا نے تمھیں جلائروں کے خاندان میں، چنگیز خاں کی اولاد میں پیدا کیا۔ تم سلطان تھے اولجائی تمھاری بہن تھی۔ یاد ہے میں نے ہمیشہ تم سے وفاداری کی۔ میں نے چغتائیوں کو سیر دریا کے اس پار ڈھکیلا، اور جیحون اور سیحوں کے درمیان کی سرزمین تمھارے حوالے کی۔ میں نے تم سے برابری اور ہمسری کا دعوے نہیں کیا تھا لیکن تم نے مجھ پر اور اپنی بہن پر جو مصیبت کے زمانے میں تمھارے ساتھی تھے، اپنی سلطنت کے زمانے میں بہت سختی کی..... مصنوعی زخم خوردہ آواز میں تیمور نے کہا "تم اس ہار کو پہچانتے ہو۔ جب تم نے لگان بڑھا دیا اور مجھ پر سختی کی تو میں نے اولجائی خاتون آغا کے زیور اتار کے لگان میں ادا کیے اور تم جانتے تھے کہ یہ تمھاری بہن کا زیور ہے، لیکن تم نے اسے بطور لگان کے قبول کیا..... تم نے مجھ پر، اور اپنی بہن کی زندگی میں اس پر رحم نہ کھایا....." اور پھر بھرے ہوئے زخمی کے شیر کے لہجے میں اس نے قاضی زین الدین کو مخاطب کیا: "میرے مرشد کامل زین الدین بابا سچ بتاؤ کیا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں غلط ہے؟"

زین الدین کا ہاتھ اسی طرح تسبیح کے دانوں سے الجھا رہا۔ دوسرے درباریوں نے بآواز بلند ندا لگائی: "امیر صاحب قراں کا ارشاد درست اور برحق ہے۔"

سلطان حسین نے پہلو بدلا۔ پہلے وہ ذرا بے تکلفی سے آلتی پالتی مارے

بیٹھا تھا۔ اب دوزانو ہو گیا۔ اس نے اس کی بڑی کوشش کی کہ اس کی آواز گلو گیر نہ ہونے پائے، اور اس کے لہجے میں کھویا ہوا وقار کھوتے سکے کی طرح کھنکتا رہے۔ اس نے کہا: "امیر تیمور گورگاں....."

آواز یں آئیں: "امیر تیمور صاحب قراں"

اُس نے کہا: "امیر تیمور صاحب قراں، خدا تجھے صاحب قرانی مبارک کرے۔ خدا سیور غامش کو سلطنت مبارک کرے۔" اس نے ایک حقارت کی نظر سیور غامش پر ڈالی جو کھسک کر تیمور کے لنگڑے پیر کے قریب آ بیٹھا تھا۔ "مجھے اب سلطنت کی ہوس باقی نہیں رہی میں اب صرف ایک استدعا کر رہا ہوں اور وہ یہ کہ مجھے اجازت ہو کہ میں حج بیت اللہ کا ارادہ کروں۔ میں اس سرزمین سے جہاں میں نے کچھ دن پہلے حکومت کی تھی۔ اپنا منہ کالا کروں۔ اور باقی ایام خانۂ کعبہ کے طواف اور توبہ و استغفار میں بسر کروں۔"

ساری یوغا اتنی آسانی سے اپنے شکار کو چھوٹتا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے کہا: "اے امیر کتنی بار سلطان حسین سے صلح کی اور دوستی بڑھائی اور کتنی بار دھوکہ کھایا....."

بابا زین الدین نے پھر ہاتھ جوڑے اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا: "امیر صاحب قراں جو لطف درگذر میں ہے انتقام میں نہیں۔ اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں..... تیمور کے قیافے پر بے صبری کے آثار دیکھ کر اُس نے کہا "میں کوئی فقہ و حدیث کا حوالہ نہیں دینا چاہتا صرف دنیاوی دانش و سیاست کا ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ واقعہ امیر معاویہ کی زندگی کا ہے جس کے متعلق یعقوبی نے یہ روایت کی ہے کہ کسی نے امیر معاویہ سے پوچھا کہ کس طرح آپ نے اپنے اطراف اتنے وفادار سپہ سالار مہیا کیے اور کس طرح دنیاوی

کامرانی میں آپ بازی لے گئے تو امیر معاویہ نے ہنس کر جواب دیا کہ اگر تازیانے سے کام چل سکتا ہے تو میں تلوار استعمال نہیں کرتا۔ اور اگر زبان سے کام چل سکتا ہے تو میں تازیانہ استعمال نہیں کرتا...... یہ روایت میں نے اس لئے بیان کی ہے کہ یہ دنیا داری کی دانش ہے۔ اسی مناسبت سے الغزی نے اپنی تاریخ میں امیر معاویہ کے حلم کی تعریف کی ہے۔ حلم کا تقاضہ یہ ہے کہ شکست خوردہ دشمن سے درگذر سے پیش آیا جائے"۔

تیمور کی پیشانی کی شکنیں اسی طرح گہری تھیں، ابرو پر وہی بل تھے۔

ایلچی بہادر جو ذرا دز اسرور کے عالم میں تھا بے صبری سے پہلو بدلنے لگا جب کو میس کا نشہ تیز ہوتا تھا تو اس کے چہرے کی سنجیدگی میں خشونت کا انداز پیدا ہونے لگتا وہ دنیا بھر سے برہم معلوم ہوتا۔

بابا زین الدین کی بات کاٹ کے اس نے اکھڑ سپاہی کی طرح تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا، سر بہ سجدہ ہو کے زمین چومی اور کہا "امیر صاحب قراں، سلطان حسین نے آپ سے بغاوت کی ہے، اور اسے اس کی سزا ملنی چاہیئے۔ یعقوبی اور رغزی مجھ جیسے سپاہی کی سمجھ سے باہر ہیں"۔

اس پر سلطان حسین کو طیش آگیا اور وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ قیدی ہے۔ جلائروں کے خاندانی دبدبے کے لہجے میں اس نے کہا "نمک حرام ایلچی بہادر تو نے یہ کیا کہا کہ ہم نے بغاوت کی ہے؟ ہم نے ہم جلائروں کے خاندان سے ہیں۔ ہماری رگوں میں ہلاکو خاں اور چنگیز خاں کا خون ہے۔ تو اپنے آپ کو مغل کہتا ہے، تو نے کبھی یاسائے چنگیزی پڑھی ہے یا پڑھوا کر سنی ہے۔ تو نے خان اعظم چنگیز خاں کا حکم نہیں پڑھا کہ سلطانی اور بادشاہی اسی کے اپنے خاندان میں رہے گی۔ تیمور اس لئے امیر ہوا کہ وہ میرے خاندان کا گورگاں ہے۔ میرے خاندان میں اس نے دامادی کی۔ اس

کی شادی میری بہن اولجائی سے ہوئی۔ اور اولجائی جو شاہزادی تھی آج زندہ نہیں پھر بتا کس نے کس سے بغاوت کی اور بادشاہت کس کا حق تھا۔۔"

اب ایلچی بہادر کا سر گھومنے لگا۔ وہ سوبوتائی بہادر کی اولاد تھا۔ جو چنگیز خاں کا دستِ راست تھا، جس نے کبھی چنگیز سے غداری نہیں کی، اور چنگیز سے غداری کر کون سکتا تھا جس نے کبھی باتو خاں سے غداری نہیں کی۔ لیکن چنگیز خاں کی بات اور تھی اور سلطان حسین کی بات اور تھی۔ یا ایلچی بہادر کے دانتوں میں ہرن کے نمکین کباب کی طرح پسنے لگی، اور پھر یاد کچھ یوں بدل گئی گویا وہ تلا ہوا گوشت تھی جسے وہ نمکین لکڑی کی طرح چبا رہا تھا۔ اور اس نے کہا۔

"بادشاہت کسی کا حق سہی مگر صاحب قرانی اور سلطنت اس کا حق ہے جس کے حق میں بدخشاں کے بوڑھے شامان نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ آگ جلا کے ایک لشکر کو شکست دے گا اور گرداڑا کے ایک شہر کو تسخیر کرے گا۔"

اور اس پر آق بوغا نے جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا صدا لگائی "ہاں سلطان حسین۔ اس وقت تم کہاں تھے، جب امیر تیمور صاحب قراں نے آگ جلا کے ایک لشکر کو شکست دی اور گرداڑا کے ایک شہر کو تسخیر کیا۔"

سیور غاتمش جو تیمور کی لنگڑی ٹانگ کے قریب خاموش بیٹھا تھا، اس طرح بول اٹھا جیسے راوی ایک دوسرے کی داستان بڑھانے کے لیے بول اٹھتے ہیں "یا جیسے شاعر ایک دوسرے کا مصرع اٹھاتے ہیں بدخشاں کا کہنا شامان؟"

بات کو کبابوں کی طرح دانتوں میں پیس پیس کر ایلچی بہادر نے کہنا شروع کیا "وہی اندھا شامان جسے آمو دریا کے پل کی لڑائی سے پہلے ہم نے بدخشاں میں چنتائیوں کا جاسوس سمجھ کے پکڑا تھا۔۔۔"

یہاں سے آق بوغا نے بات اٹھائی "مگر شامان چنتائی نہیں، قپچاقی لہجے

اشاعت : جنوری۔ فروری سنہ ۱۹۶۶ء

مطبوعہ دہلی پرنٹنگ پریس رام پور

میں انجوری بولتا تھا۔ معلوم نہیں کس دھن میں قپچاق کی ہری بھری چراگاہیں چھوڑ کے بدخشاں کے برف زادوں میں آنکلا تھا۔ بودھ مت کے بھکشوؤں کی طرح کہا کرتا تھا کہ یہیں پہاڑوں میں من کے کوکو نیلگری سے لو لگائی جا سکتی ہے۔ حالانکہ یہ بات بالکل میری سمجھ میں نہ آئی کیونکر نیلا جادوانی آسمان قپچاق کے مرغزاروں سے تو صاف صاف نظر آتا ہے مگر بدخشاں کے پہاڑوں میں بادلوں سے گھرا رہتا ہے۔۔۔۔"

بات کاٹ کے ایلچی بہادر نے کہا "حضور امیر صاحب قراں' بابا زین الدین کی طرح آق بوغا نے بھی لن ترانی شروع کر دی وہ عربی لن ترانی تھی یہ تو ترانی لن ترانی ہے۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں تو صرف سلطان حسین سے کہنا چاہتا تھا کہ میں نے جو امیر تیمور سے وفاداری کا عہد باندھا وہ اس لیے تھا کہ سلطان حسین کا تو دُور دُور کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ مگر چغتائیوں کے مقابلے میں امیر تیمور نے گرمابہ کے ایک حصار کو تسخیر کیا۔"

تیمور کے چہرے پر تحسین کی ایک جھلک تھی۔ عدالت وقتاً فوقتاً روایت گاہ بن گئی تھی۔ ایلچی بہادر نے نمکین مچھلی' اور تلے ہوئے باداموں کی آہستہ آہستہ جگالی شروع کی۔

"سلطان سیور غامش' تم اس زمانے میں ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ میرے رفیقوں کو یاد ہوگا کہ ہم سب چالیس آدمی تھے۔ سب سے آگے آگے امیر تیمور گورگاں' اُن کے پیچھے اولجائی' تُرکان آغا' پھر حاکو برلاس پھر میرا یہ یار آق بوغا' پھر میں تھا' اور پھر اور سب تھے۔ اور پہاڑی پگڈنڈی بہت تنگ تھی۔ گھوڑوں کے سُم بار بار چٹانوں کی نوکوں سے ٹکراتے۔ ڈھلوانوں پر گندی گندی برف چمک رہی تھی۔ ہم جہاں کہیں دم بھر کو ٹھہرتے لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیتے۔ ہمارے گھوڑے نرم برف سے رستے ہوئے پانی کی دھلی ہوئی گھاس

کو اس طرح چباتے جیسے مرغ کی یخنی میں ڈوبی ہوئی ترکاری ہم لوگ کھاتے ہیں پہاڑی درندے خال خال تھے۔ مگر جب ایک موڑ پر امیر گورگان نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑی تو ان سے چند قدم کے فاصلے پر ایک پہاڑی تیندوا اسی پگڈنڈی پر سامنے کھڑا ہوا ملا۔۔۔۔"

اس یاد کے جادو سے تیمور کی پیشانی پر روشنی سی جھلکنے لگی۔ اور وہ بے ساختہ بول اٹھا: "مجھے خوب یاد ہے۔ بالکل میرے مقابل، گویا یہ مقابلہ کرنے کو آنکلا تھا۔ مجھے اس کا رنگ یاد ہے۔ برف کے سمور کی طرح سفید اور اس پر بھورے بھورے دھبے تھے۔ بہت کم نر غے میں میں نے ایسے خوبصورت جانور دیکھے ہیں۔ جاکو برلاس نے کمان اٹھائی تو میں نے اسے روک دیا اور کہا: "کہ یہ میری تقدیر کی نشانی ہے۔ اگر اس زخمی ہاتھ سے تیر چلا کے میں نے اس تیندوے کو مار لیا تو میرے تاج کے چالیس ساتھی ایک دن چالیس ہزار بن کے چغتائیوں کو شکست دیں گے۔"

آق بوغا نے کہا: "اور جب حضور نے تیر چلایا تو چشم زدن میں تیندوا وہیں ڈھیر تھا۔۔۔۔ اور یہی حال امیر صاحب قراں کے اور دشمنوں کا ہوگا۔" اس پر سب نے نظر بھر کے سلطان حسین کو دیکھا، جس کے چہرے کا رنگ سفید پڑتا جا رہا تھا۔

ایلچی بہادر نے کہا: "جیسا امیر صاحب قراں نے ارشاد کیا تھا وہی ہوا۔ برلاس سوار آتے گئے اور ہماری تعداد بڑھتی گئی۔ اور ہم اپنے پیارے آمو دریا کے کنارے کنارے بڑھتے گئے، جس کے اس پار دشمن کا پڑاؤ تھا۔ اُدھر بکی جوک کا لشکر تھا، اور ایک مہینے تک ہم آمو دریا کے آر پار اس سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔ مغل فوج ہمارے ساتھ ساتھ بڑھتی۔ ہمارے

ساتھ ساتھ پیچھے ہٹتی اور روز تیروں کے بادل اس کنارے سے اُس کنارے اور اُس کنارے سے اِس کنارے تک امڈتے اور برستے جاتے یہاں تک کہ ہمارے پیارے آمو دریا

ایک نرالی وادی میں قدم رکھا۔ جس میں نہ سبزی تھی نہ صنوبر تھے۔ کالی کالی چٹانیں تھیں۔ جن کے کنارے کائی جم رہی تھی۔ اور گھوڑوں کے قدم پھسلتے تھے، اور یہاں پتھر کا ایک مضبوط پُل تھا۔ کالا پل۔ مضبوط پُل، آمو کے اس پار سے اُس پار تک۔ اس پل پر امیر نے معاوہ اور امیر موسےٰ کے ساتھ پانچ سو برلاس سوار چھوڑے اور ہم سب امیر کے ساتھ مغلوں کی فوج کے پیچھے والی پہاڑیوں میں جا پہنچے۔ یہاں امیر تیمور کے حکم سے ہم سب منتشر ہو گئے اور ہم نے دور دور تک پہاڑیوں میں آگ جلائی۔ آدھی رات کو جب بکی جوک نے اپنے آگے پیچھے، ہر طرف دور دور تک آگ جلتی دیکھی اور سرمئی دھواں پھیلتا دیکھا تو سمجھا کہ ہماری فوج اس سے کئی گنی زیادہ ہے، حالانکہ اس کی فوج ہم سے دس گنی تھی۔ سمجھا کہ وہ ہماری فوج سے گھر گیا۔ سمجھا کہ شطرنج ہار گیا۔ سمجھا خیریت اسی میں ہے کہ بچ کر نکل جائے اور جب وہ بھاگ گیا تو اس طرح اندھے بدخشانی شامان کی پہلی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ امیر گورگاں نے صرف آگ جلا کے ایک جرار لشکر کو شکست دی۔ سلطان حسین اس وقت تم کہاں تھے؟"

اور اس پر آق بوغا نے کہا "ایلچی بہادر تجھے یاد ہے۔ اس واقعے کے بعد ہمارے آقا امیر صاحب قراں نے کہا آق بوغا وہ اندھا شامان جھوٹا نہیں تھا۔ اگر وہ پیشین گوئی نہ کرتا تو مجھے آگ کا لطیفہ ہرگز نہ سوجھتا۔ اب چل دوسری پیشین گوئی پوری کر دکھائیں۔" آق بوغا کے انداز بیان میں قلقل ہندی کا سرخ سرخ چٹخارہ نہیں تھا۔" امیر نے کہا سب سے پہلے ماوراالنہر

کا جو شہر چغتائیوں سے آزاد ہوگا وہ میرا اپنا شہر، میرا شہر سبز ہوگا تو اپنے ساتھ دو سو سوار لے۔ ان سواروں کی رکابوں کے دونوں طرف سو کمی ہوئی خاردار جھاڑیاں اس طرح باندھ کہ جب وہ گھوڑوں کو سرپٹ دوڑائیں تو بے حد گرد و غبار بلند ہو۔ اور ان سواروں کے ساتھ تو علی الصباح شہر سبز کی فصیلوں کا طواف شروع کر۔ الغرض صبح سے لے کر نصف النہار تک ہمارے گھوڑے شہر سبز کی فصیلوں کا طواف کرتے رہے۔ گرد و غبار کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ لاکھوں کا لشکر شہر کا طواف کر رہا ہے۔ چغتائی دستے نے سفید جھنڈا لہرایا اور شہر کے دروازے کھول دیئے۔ اس طرح اندھے شامان کی دوسری پیشین گوئی پوری ہوئی۔"

دربار میں "سبحان اللہ سبحان اللہ" کا شور بلند ہوا۔ اور تیمور نے زور سے قہقہہ لگایا: "بابا زین الدین تم نے امیر معاویہ کی روایت کیا شروع کی میرے بہادر سرداروں کو راوی بنا دیا۔"

ایلچی بہادر نے کہا: "سلطان حسین اس وقت تم کہاں تھے۔ تم جب چغتائیوں سے لڑے۔ غلط طریقہ پر لڑے۔ اور ہمیشہ منہ چھپاتے پھرے۔"

امیر تیمور کے چہرے پر کڑوی، استہزا کی ہنسی کے آثار پیدا ہوئے، لیکن اس نے اپنے آپ کو روک کے للکار کے کہا: "ایلچی بہادر خاموش۔"

پھر اس نے سلطان حسین کی طرف دیکھا: "حسین اس میں کوئی شک نہیں کہ بادشاہت کا حق تجھے پہنچتا تھا۔ مجھے نہیں لیکن میں نے کبھی بادشاہت کا دعوے نہیں کیا۔ جب تو میری جان کے درپے ہوا تو میں نے تیرا مقابلہ کیا۔ میں نے قرشی کو تسخیر کیا۔ میں نے سمرقند فتح کیا۔ مجبوراً میں نے سیورغاتمش کو بادشاہ بنا دیا۔ یہ کیا میرے قدموں سے لپٹا ہوا بیٹھا ہے۔ یہی سیورغاتمش تاتار کا بادشاہ

ہے۔ میں مانتا ہوں کہ سلطانی یا خاقانی کسی گورگاں کو نہیں ملے گی۔ بادشاہ چنگیز خاں کی نسل سے ہو گا۔ لیکن پہلے وہ ہلاکو خاں کی نسل سے تھا۔ اب چغتائی خاں کی نسل سے ہے۔ اس لئے اب ماورالنہر میں تیرا کوئی مقام نہیں۔"

سلطان حسین نے کہا: "میں تخت و تاج سے دست بردار ہو چکا ہوں مجھے بیت اللہ جانے کی اجازت دو۔"

تیمور نے آنکھیں بند کر لیں۔ گویا وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ ایلچی بہادر نے پھر آق بوغا سے باآواز بلند کہا: "اس بہانے ایک مرتبہ پھر چنگل سے نکل گیا تو پہلے کی طرح پھر سر اٹھائے گا اور امیر صاحب قراں سے پھر بغاوت کرے گا۔"

امیر تیمور نے ڈانٹ کر کہا: "ایلچی بہادر خاموش۔"

جب دربار میں خاموشی چھا گئی تو امیر تیمور نے باآواز بلند کہا: "کسی اور امیر کو کچھ اور کہنا ہے۔ سلطان حسین کو میں کوئی سزا اس لئے نہیں دے سکتا کہ جب وہ میرا حریف تھا۔ اس ملک کا بادشاہ تھا آج جب کہ وہ بادشاہ نہیں، وہ صرف اس ملک سے باہر حج بیت اللہ کو جانے کی اجازت چاہتا ہے۔ میں اسے روک نہیں سکتا۔ کوئی اور امیر ایسا ہے کہ جسے سلطان حسین سے کوئی اور شکایت ہے۔ اگر ہے تو وہ ابھی بیان کرے کیونکہ میرے دربار میں انصاف ہے جبر نہیں۔"

تیمور کی آنکھوں میں چالاکی اور مکر کی ایسی بے پناہ چمک تھی کہ بابا زین الدین نے سر جھکا لیا۔ سب سمجھ گئے کہ اب کے جو چال چلی جائے گی۔ اصلی شہ مات وہی ہے۔

عین اس وقت اس بے ساختگی سے جیسے کوئی مہرہ خود بخود لڑھکے جیسے برابر برابر کی بازی کے درمیان یکلخت خطرناک طور پر شہ پڑ جائے، ایک نوجوان نے دوزانو ہو کر فریاد کی: "بادشاہی آپ کا۔ سلطان حسین کا

اور ـــــ سیور غامش کا آپس کا معاملہ ہے۔ میں آپ سے انصاف کا طالب ہوں کہ مجھے اپنے بھائی اولجاتیو کے خون کا قصاص ملنا چاہیئے۔"

یہ مہرہ جو یوں بے ساختہ اٹھا تھا تیمور نے سلطان حسین کی گرفتاری کی اطلاع سنتے ہی محض اس موقع کے لئے جما دیا تھا۔ اب تک وہ خاموش تھا۔ اب اس نہرے کے چلنے سے سناٹا سا چھا گیا۔

امیر تیمور نے قاضی زین الدین کو اشارہ کیا۔ "بابا زین الدین۔ یہ امیر بلخ کیخسرو کی فریاد ہے۔ سلطان حسین کے حکم سے اس کے بھائی اولجاتیو کو قتل کر دیا گیا تھا۔ تم نے مجھے انصاف کا مشورہ ہمیشہ دیا ہے۔ اور میں نے ہمیشہ مانا ہے۔ اب تم انصاف کا فتوے دو۔۔۔۔۔"

سلطان حسین نے کہا "مجھے یہ واقعہ یاد بھی نہیں۔ لیکن امیر تیمور کسی نے آج تک بادشاہ پر قتل کا الزام لگایا ہے؟ کیا ہر جان بادشاہ کی ملکیت اور اس کے اختیار کی چیز نہیں؟"

مگر شاطر کے چہرے کے اعصاب سخت ہو گئے۔ اور اس نے کہا "یہ معاملہ انصاف کا ہے۔ اس کا باقاعدہ فیصلہ ہونا چاہیئے۔ میں اس میں دخل نہ دوں گا۔" اور پھر اس نے حکم اور تقویٰ کے ملے جلے ہوئے لہجے میں کہا "ورنہ کل داور محشر کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

اس نے نظر اٹھا کے دیکھا۔ اس کے سامنے ایک خمیدہ قامت پیر مرد عصا کا سہارا لئے کھڑا تھا۔ اور پیر مرد کے جسم میں رعشہ تھا۔ یہ اس کا پرانا رفیق۔ اس کا استاد قاضی زین الدین تھا۔

زین الدین کی رعشہ دار آواز میں لجاجت بھی تھی اور ملاحت بھی۔ "اے میرے امیروں کے امیر اے سرداروں کے سردار جس داور محشر کا تو نے نام لیا وہ عادل ہے

میں نے مانا کہ وہ رحیم بھی ہے اور قہار بھی۔ وہ سب کچھ ہے مگر مدعی نہیں۔ اور قاضی اگر مدعی بھی ہو تو انصاف کیا خاک کرے گا۔ وہ کسی فریق کا فریق مخالف نہیں۔"

بوڑھے کی نظروں میں ایک طرح کا جلال تھا جس کے آگے تیمور کا اپنا جلال ماند تھا۔ اس نے کہا "بابا زین الدین آپ تشریف تو رکھیں۔ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن اب تو اس قضیے میں ایک فریق امیر کبیر ہے جو مدعی ہے اور دوسرا فریق سلطان حسین ہے۔ میری حیثیت اس مقدمے میں منصف اور قاضی کی ہے۔ کیا آپ مقدمے کی اس صورت کو تسلیم نہیں کرتے؟"

بابا زین الدین نے اسی طرح بھرائی ہوئی آواز میں رُک رُک کر جواب دیا۔ "میں کیا اور میری مجال کیا کہ آپ کے مقدمے کی اس صورت کو تسلیم کروں یا نہ کروں لیکن آپ ہی کے والد نے مجھے شہر سبز کا قاضی مقرر کیا تھا۔ پھر آپ کے نانا کازغان نے مجھے سمرقند میں قاضی القضاۃ بنایا۔ میں نے ہمیشہ آپ کی اور آپ کے خاندان کی خدمت کی اور آپ کا خاندان سلطان حسین کے خاندان سے الگ نہیں۔۔۔"

شاطر گویا لمحہ بھر کے لئے مات کھا گیا۔ اس دہکتے ہوئے جہنم میں کہیں ٹھنڈا نور تھا جو اُبل پڑا اور تیمور نے کہا۔ "اگر آپ چاہیں تو بجائے خود فیصلہ کر دیں۔ میں سلطان حسین کا مقدمہ آپ کے سپرد کرتا ہوں۔"

زین الدین کی تھکی ہوئی آواز نے جواب دیا۔ "میں کیا اور میری بساط کیا لیکن اے امیر میں اب چراغ سحری ہوں۔ اس مقدمے اور اس کے بعد کے ہر مقدمے کی سماعت خود آپ کو کرنی ہے۔ جب میں نے آپ کے لئے امیر صاحب قراں کا لقب تجویز کیا تو خوشامد کی بات نہیں تھی۔ میں نے آپ کی پیشانی پر اقبال کا ستارہ چمکتا دیکھا جو اگر آج توران میں چمک رہا ہے تو کل مصر، روم، شام اور قپچاق پر چمکے گا۔ اب یہ آپ کے اختیار کی بات ہے کہ یہ جبر کا ستارہ ہو گا یا عدل کا۔ یہ پہلا مقدمہ آپ

کا پہلا امتحان ہے بظاہر سلطان حسین کا حریف اور مدعی کیخسرو ہے۔ لیکن کیخسرو کو مدعی بننے کی جرأت اس لئے ہوئی ہے کہ اصلی مدعی آپ ہیں اے امیر اگر اس بوڑھے کی زبان کٹوانی ہو تو کٹوا دیں۔ لیکن جب تک اس زبان میں طاقت گویائی ہے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ عدل میں سازش کا کوئی مقام نہیں۔ عدل ایک مقصود بالذات صفت ہے اور یہی میری ساری زندگی کے سارے تجربہ کا نچوڑ ہے۔ اس سے زیادہ اس بوڑھے نمک حلال کو کچھ اور نہیں کہنا ہے۔۔۔۔"

جب زین الدین اپنی تقریر ختم کر چکا تو پرانے جاں نثاروں نے۔ ایلچی بہادر نے، اور جاکو برلاس نے، اور آق بوغا نے دیکھا کہ تیمور کے چہرے کا رنگ بدل چکا تھا۔ اس کی نظریں سامنے قالین پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کی پیشانی کی تینوں لکیریں اور گہری ہو گئی تھیں۔ اور وہ گہری سوچ میں تھا۔ اس وقت پورے دربار پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ زور سے سانس لے سکے یا پہلو بدل سکے۔

دفعتاً زور سے تیمور نے اپنی ران پر ہاتھ مارا اور کہا "خدا کی قسم میں اس وقت کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اب دن ڈھلتا جا رہا ہے۔ صبح کو سلطان حسین کو پھر دربار میں پیش کیا جائے۔"

محافظ دستے کے سپاہی سلطان حسین کو حراست کے لیے لے گئے اور جب تیمور دربار کو برخاست کرنے کے لئے اٹھنے لگا تو اس نے پوچھا۔ "بابا زین الدین آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟"

قاضی زین الدین نے کہا: صرف اتنا کہ جب جسم کو فولاد کا زرہ بکتر پہنایا جاتا ہے اور سر پر آہنی خود اوڑھا جاتا ہے، تب بھی آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ حالانکہ آنکھیں جسم کا سب سے نازک حصہ ہیں۔ لیکن جب آنکھیں آہن پوش ہو جائیں تو زرہ

بکتر بیکار ہے، فولادی خود بیکار ہے، تیر اور تبر، ڈھال اور تلوار بیکار ہے۔ عدل میں اتنا ہی خطرہ ہے جتنا آنکھیں کھلی رکھنے میں۔ لیکن آنکھیں آہن پوش ہونے میں اور زیادہ خطرہ ہے۔"

تیمور نے کہا: "میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔"

۴

آدھی رات کو اردو میں خاموشی سی چھا گئی، یعنی اگر اردو میں خاموشی ممکن ہے کیونکہ گھوڑوں کے ہنہنانے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں لگاتار آ رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد نقیبوں کی گشت اور ان کی تلواروں کے کھڑکھڑانے کی آواز آتی۔ خیمے کی سیاہ اطلسی چھت کے نیچے قالینوں کے نرم فرش پر سرائے ملک خانم غافل سو رہی تھی۔ تیمور نے اس کے جوان، خوابیدہ، مقبوضہ حسن کی طرف دیکھا اور پھر شطرنج کی بازی میں محو ہو گیا جو وہ ہمیشہ کی طرح اپنے آپ سے اکیلا کھیل رہا تھا۔ اور پھر اس نے ایک ہاتھ مار کے تمام مہرے بکھیر دیئے اور اپنے اور سلطان حسین کے متعلق سوچنے لگا۔

یادکی بساط پر ایام کے پٹے ہوئے مہرے پڑے تھے، جو دن کو تو فوجوں کے کوچ تلواروں کی چمک، ڈھالوں کی کھڑکھڑاہٹ اور رزم و بزم کے ہنگاموں میں یاد نہ آتے، لیکن راتوں کو بے شمار ستاروں کی طرح نیلگوں جاودانی آسمان

۱

ویران مینار کی سیڑھیوں پر شکست خوردہ تاجدار کو انجام کا انتظار تھا۔ قزل قم اور قراقم کی شطرنج پر ایک ایک کر کے سب مُہرے پٹ چکے تھے۔ شہ مات پر شہ مات۔ بامیان کے اسپ اور کابل کے پیادے سب نثار ہو چکے تھے قرشی میں امیر ہوتے کا رُخ کب کا کام آچکا تھا، تو ران کے اشتر اور منگول فرزیں اور اب شاہ اکیلا تھا۔ زچ ہو چکا تھا۔ مگر جنگ کی شطرنج کھیل کی شطرنج سے الگ تھی۔ زچ ہونے پر بھی ملک الموت کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اسی طرح سنائی دیتی تھی۔ اور اب چنگیز کی نسل کے آخری جلاّ تاجدار سلطان حسین کو اس کا انتظار تھا کہ اس ویران مینار میں اس کے گوشت کے آرپار ہڈیوں تک پہلے کون سا حربہ پہنچے گا؟ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں چکر لگاتے ہوئے کرگسوں کی چونچیں یا تیمور کے کسی سپاہی کا خنجر۔

اس کے ہاتھ میں تاجدار بچاری کی سنہری شاخ تھی۔ جس سے وہ اُس

کے پردے سے جھانکتے، جگمگاتے اور چھپ جاتے۔ گویا دن کی ساری مہم رات کے ان گنت تاروں، ان ایام ان یادوں سے فرار کے علاوہ کچھ اور نہ تھی۔ اور وہ جس کا ثانی عمل اور حرب اور دن کی دنیا میں کوئی اور نہ تھا۔ رات کو وہ بھی ان بیخواب ستاروں کے آگے بے بس تھا کیونکہ ان گذرے ہوئے ایام کی ہر بازی خواہ وہ جیتی ہوئی بازی ہو یا ہاری ہوئی دراصل ہاری ہوئی بازی تھی ہر روز جو ختم ہو چکا تھا اب نیلگوں جادو والی آسمان پر تارہ بنکے چمک رہا تھا۔ ایک شہ مات تھا، اور ہر ستارہ اس طرح جھلملاتا جاتا تھا گویا یہ کل ہی کی بات ہو۔ اور ہر ستارہ کی چمک ریا کی، دغا کی فریب کی چشمک تھی۔

اور بابا زین الدین کے الفاظ۔ آج کے الفاظ نہیں کئی برس پہلے کے الفاظ جب جہانگیر شیر خوار بچہ تھا اور اولجائی حسین تھی، جوان تھی ـــــ اور زندہ تھی۔ یہ الفاظ کہ چغتائیوں کا خان تغلوق اس طرح ہمارے سروں پر نمودار ہوا جیسے شہباز کا فوری پر جوڑ کر قمریوں کی ٹولی میں آگرتا ہے۔ اور چچا حاجی برلاس (نچیلی داڑھی کرنجی آنکھیں، مکروہ دہانہ) کی بدحواسی اور ریاکاری۔ "تیمور۔ میرے بیٹے تیرے باپ تارگائی کے مرنے کے بعد میں ہی برلاسوں کا سردار ہوں۔ یہ بھی کوئی شک کی بات ہے؟" بزدلی کے پسینے کے قطرے۔ "بایزید جلائر تیری بیوی کا چچا ہمیں دھوکا دے چکا ہے۔ کہہ گیا تھا کہ خجند پر وہ جم کر چغتائیوں کا مقابلہ کرے گا لیکن اس نے پہلے ہی تغلوق خاں کے اردو میں پہنچ کر چغتائیوں کی اطاعت کرلی۔ اب ماوراالنہر میں مقابلہ بیکار ہے۔ چل ہرات چلیں، اور جتنے بچے عورتیں مویشی ساتھ چل سکیں ہرات لے چلیں سمرقند جانے اور اس کی قسمت۔ ویسے سمرقندیوں نے ہم برلاسوں سے کون سا اچھا سلوک کیا ہے جو ہم لوگ ان کے لئے اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں۔ سمرقند اور قرشی اور شہر سبز کو لوٹ کے چغتائیوں کا جی بھر جائے گا

اور وہ اپنا راستہ لیں گے۔"

تیمور نے اسے ٹوک دیا "کیا کہا آپ نے؟ شہر سبز، جہاں میرے باپ کی ہڈیاں دفن ہیں۔"

اور وہی دن تھا جب سلطان حسین سے اس کی رفاقت کا آغاز ہوا تھا۔ رفاقت اور رقابت دونوں کا۔ اپنے خیمے پہنچ کر اس نے اولجائی سے کہا تھا "تیرا چچا چغتائی مغلوں سے مل گیا اور میرا چچا ان سے بھاگ کے ہرات جا رہا ہے۔ میرے خیال میں تیرا چچا زیادہ عقلمند ہے۔"

اولجائی نے جہانگیر کو جو ابھی چھوٹا تھا اٹھا کے پیار کیا۔ اور اس طرح پوچھا جیسے یہ کوئی بالکل معمولی سی بات ہو۔ "اور تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

"چغتائی مغل لوٹ اور مال کے بھوکے ہیں۔ وہ شہر سبز اور قرشی اور سمرقند کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور پھر یہ علاقہ ہے بھی تو انھیں کا۔ تیرے نانا کا رخان نے ان سے بغاوت کر کے اس علاقہ کو آزاد کرایا تھا۔ اب مغل پھر اپنا حق مانگتے ہیں جو انھیں چنگیز اور چغتائی سے ملا ہے میں نے تو تغلوں کے اردو میں پہنچ کے اطاعت کرنے کا ارادہ کر لیا ہے یہی صورت ان شہروں کے بچانے کی ہے۔۔۔۔"

اولجائی خاموشی سے سنتی رہی جیسے وہ ہمیشہ خاموشی سے سنتی رہتی تھی، شکایت کے بغیر، ہراس کے بغیر۔

اور تیمور نے اس کی گود سے جہانگیر کو لے لیا۔ وہ مسکرائی۔ عام طور پر تیمور اپنے بچے کو گود میں لیتے ہوئے گھبراتا تھا۔ مگر جہانگیر کو اس نے گود میں لیا۔ اس کے ابرو چمکے اولجائی کھلکھلا کر ہنسی۔ اور تیمور نے پھر اسی سنجیدہ چہرے کے ساتھ جس پر مسکراہٹ کا کہیں شائبہ نہ تھا۔ آہستہ آہستہ کہا گویا اپنے آپ سے سرگوشی کر رہا ہے: "لیکن چغتائیوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ کوئی اعتبار نہیں۔ تو غلوق خاں کے اردو میں جانا اپنی

جان کو ہتھیلی پر لے کر جانا ہے۔ میں تجھ کو اور جہانگیر کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ تجھے میں اپنے چچا حاجی برلاس کے ساتھ ہرات بھیج رہا ہوں، وہاں سے تو اپنے بھائی سلطان حسین کے پاس کابل چلی جائے گی اور تو اور جہانگیر وہاں محفوظ رہیں گے۔"

[پہلی مرتبہ سلطان حسین کا نام اس طرح آیا گویا مغلوں کے خلاف دماغ میں تیمور کی اور سلطان حسین کی تقدیر منسلک تھی۔]

آہستہ آہستہ اولجائی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور اس کے چکنے سُرخ رخساروں پر سیتال نمک کی طرح ڈھلکنے لگے۔ [تیمور نے یہ یاد کر کے ایک گہری آہ بھری اور اپنے سمور کے کمبل میں کروٹ لی] اور پھر اولجائی نے سر جھکا لیا۔ اور کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب اس کا دل دے چکا تھا، اور تیمور اس جواب کو جانتا تھا کہ "میں تمھارے ہی ساتھ جینا اور تمھارے ہی ساتھ مرنا چاہتی ہوں۔ لیکن جو تم کہہ رہے ہو ٹھیک ہے میں مغلوں کے ہاتھ پڑنا اور ان کی لونڈی بننا نہیں چاہتی۔ نہ میں یہ چاہتی ہوں کہ میرا بچہ جہانگیر غلاموں کی طرح پلے۔ خیر یہی سہی۔ میں اپنے بھائی سلطان حسین کے پاس کابل چلی جاؤں گی۔"

اور پھر مغلوں کے مقابل بساط، چنتائی مال کے بھوکے ہیں۔ جواہرات سے جب آنکھیں چوندھیا جائیں۔ تو آنکھوں میں سلائی بھونک دی جائے۔ یہاں تک کہ نقیبوں نے خبر دی کہ چنتائیوں کے ہراول دستے پہاڑیوں سے اتر اتر کے وادیوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوفناک سپاہی جو چھوٹے چھوٹے بڑی بڑی ایالوں والے پہاڑی ٹٹوؤں پر سوار تھے۔ ہر ایک کے پیچھے کئی کئی ٹٹوؤں پر لوٹ کا مال اسباب حسین دوشیزائیں جنکے چہروں پر نقاب نہیں تھے، جن کی زلفیں سوگوار تھیں۔ مغل سواروں کے کاندھوں پر لمبے لمبے نیزے۔ ان کے ٹٹو گیہوں اور جو کی بکی ہوئی کھیتوں کو اس طرح چر رہے تھے، جیسے یہ ان کے لئے بوئی ہوئی گھاس ہے۔ انسان کی محنت اور غذا نہیں۔

تیمور یہ سن کر اپنے موروثی محفل سے باہر نکل آیا۔ اور جب چغتائی سردار اول دستے کا سردار وہاں پہنچا تو اس کا اس طرح استقبال ہوا جیسے کوئی مہمانوں کا استقبال کرتا ہو۔ ضیافت کے لئے دسترخوان بچھے۔ سلم بھیڑیں۔ بچے کٹوں کی آگ پر بھونی جانے لگیں۔ چاولوں کے بڑے بڑے خوانوں پر سیلے گوسفند ہاتھ بڑھے۔ احتیاط سے مغلوں میں اتنی کوہیس تقسیم کرائی گئی کہ وہ سرور کے عالم میں رہیں لیکن اتنی زیادہ نہ پی جائیں کہ شہر سبز میں لوٹ کھسوٹ شروع کر دیں۔ چغتائی سردار ایک بھیڑ کی ٹانگ نوچ نوچ کے کھا رہا تھا اور تیمور تو غلوق خان سے اپنی امارت کا اظہار کرتا جا رہا تھا۔ تیمور نے یہاں تک کہہ دیا کہ تو غلوق خاں نے مجھے خفیہ پیغام بھیجا ہے کہ تو نے اپنے اصلی بادشاہ تو غلوق خاں کی اطاعت قبول کر لی ہے۔ تجھے شہر سبز کی سرداری دوبارہ عطا ہو گی۔ یہ سن کر چغتائی سردار شہر سبز کے اس سفید محفل کے لوٹنے کی امید سے اور مایوس ہو گیا لیکن اس نے چکنے چکنے ہونٹوں پر چکنی چکنی زبان پھیر کے چاندی کے آفتابوں کی مبالغہ سے تعریف کی اور تیمور نے یہ آفتابے اس کی نذر کر دیئے پھر اس نے کوہیس کے طلائی جام کی تعریف کی اور تیمور نے یہ بھی اس کی نذر کر دیا۔ اور اس سے تو غلوق خاں کے اردو تک پہنچنے کا پروانہ لیا۔ اور پھر شہر کی قحباؤں کو مغلوں کے خیموں میں بھیج دیا۔ جہاں دوسرے شہروں کے شرفا کی بہو بیٹیاں کنیزوں کی طرح گھوڑیوں کا دودھ دوہ رہی تھیں اور کوہیس تیار کر رہی تھیں۔ اور ان کے گریباں کھلے ہوئے تھے۔

اور پھر مغل خیمہ و خرگاہ۔ دور دور تک نوجی گھوڑے اور باربرداری کے ٹٹو بوئی ہوئی کھیتوں یا پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر شبنم سے دھوئی ہوئی نرم گھانس چر رہے تھے۔ اونٹ اطمینان سے بیٹھے بیٹھے اوپر گردن اٹھا کے میوے درختوں کے پتے اپنے جبڑوں سے چبا رہے تھے اور کف نکالتے جاتے تھے۔ مویشیوں کے ریوڑ چراگاہوں سے جگالی کرتے ہوئے واپس آ رہے تھے۔ اور قریب مطبخوں کی آگ

جل رہی تھی، اور ان پر بڑی بڑی دیگوں میں گوشت کے ٹکڑے اور چاول ابالے جا رہے تھے، کومیس کی سڑانڈ اور اس کے اُبال کی بدبو کے بھپکے اڑ رہے تھے۔ خیمے دس دس سو سو، ہزار ہزار کے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے اور بڑے بڑے خیموں سے گھوڑے کی دُم کے بالدار جھنڈے لہرا رہے تھے۔ جب زور سے ہوا چلتی تھی تو آدمیوں کے قدموں، گھوڑوں کی ٹاپوں اور بھیڑ بکریوں کے گلے سے خاک اور گوبر سے ملا جلا ایک غبار سا اٹھتا اور چکر کاٹتا ہوا خیموں کے درمیان غائب ہو جاتا۔ چغتائیوں کے سفید خیموں کا ایک سمندر تھا کہ دُور دُور تک لہریں مارتا نظر آتا تھا۔

نقیبوں کے گھوڑے تیمور اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ ہو گئے۔ جب وہ خیموں کے درمیان سے اس مال و اسباب کے ساتھ گذر رہا تھا، تو ہزارہا مغل سپاہی اپنے خیموں سے نکل نکل کے اس کے اسباب کی طرف للچائی نظر سے دیکھتے اور جب تک وہ گذر جاتا دیکھتے رہتے۔ یہ سپاہی چینی اطلس کے لبادے پہنے تھے۔ جن پر رنگ برنگ کے سنہری، قرمزی، سبز لاجوردی پھول اور طرح طرح کے جانور کڑھے ہوئے تھے۔ ان کے پاؤں میں لکڑیوں کی کھڑاویں تھیں، مگر کھڑاؤں پر چرمی تسمے تھے جن پر سنہرا کام بنا ہوا تھا۔ ان کی مونچھیں، پتلی لکیروں کی طرح دہانے کی دونوں جانب رخساروں پر نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ اور اب تو تیمور کے اپنے وطن میں بھی اس طرح کی مونچھیں بہت مقبول تھیں۔ نہ ان کے چہروں پر داڑھیاں تھیں، نہ ان کے دلوں میں خدا کا خوف۔

[امیر تیمور نے تغلوق خاں سے اپنی ملاقات یاد کی] وہ اپنے خیمے میں جس کے دروازے کے قریب گھوڑے کی دُم والا علم لہرا رہا تھا، ایک شہنشاہ کی سی صولت و جبروت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ فرش سموروں کا تھا، قالینوں کا نہیں یہ دشت و جبل کی فضا تھی۔ شہروں کی نہیں۔ تغلوق کی پیشانی چوڑی تھی، اور

گالوں کی ہڈیاں برلاسوں اور دوسرے تاتاریوں اور ترکوں کے مقابل زیادہ ابھری اور اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ چنگیز کی نسل کا صحیح النسب خان تھا۔ اس کی آنکھوں میں جنگلی لومڑیوں کی سی مکاری تھی، اور نیچے جھکی ہوئی مونچھوں کے ساتھ ساتھ اس کی ٹھوڑی پر چھوٹی سی چینی داڑھی تھی جس کا بال بال چھنکا ہوا تھا۔

تیمور مغل انداز میں کورنش بجالایا۔ اور اس کے آداب ایسے شائستہ تھے کہ چغتائی سردار جو خان کے اطراف نصف دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے دل میں تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔

الغو ری جو اس کی اور چغتائیوں کی زبان تھی، تو غلوق خاں نے اس سے پوچھا "تمھارا نام تیمور ہے؟"

شائستگی اور بے خوفی سے تیمور نے جواب دیا "میرا نام تیمور ہے۔ میں برلاسوں کا سردار ہوں۔ مجھ سے پہلے میرا باپ تارگائی برلاسوں کا سردار تھا، لیکن اس نے اللہ کی طلب میں یہ دنیا چھوڑ کے درویشوں کی زندگی اختیار کی۔" اس پر چغتائی کافر سردار بدتمیزی سے کھلکھلا کے ہنسے! "میرے باپ کے بعد برلاسوں کی سرداری اور شہر سبز اور قرشی کی ولایت میرا حق ہے لیکن میرے چچا حاجی برلاس نے یہ حق غصب کر رکھا ہے۔ اسی لئے میں تیری اطاعت کرنے حاضر ہوا ہوں کہ مجھے میرا حق عنایت کر۔"

تیمور دیکھ رہا تھا کہ اس کے الفاظ تو غلوق خاں پر اثر کر رہے ہیں۔ اس نے کہا: "خان اعظم چنگیز خاں اور چغتائی خاں کے زمانے سے ماوراالنہر کی سرزمین تیرے آباواجداد کی اور تیری ہے۔ میں تجھے اپنا آقا اور سرپرست مانتا ہوں۔ لیکن میرے چچا حاجی برلاس نے تیرا مرتبہ نہیں پہچانا اور وہ جنوب کی طرف بھاگ گیا۔ میں نے برلاسوں کی وادی کی ساری دولت بچالی اور اسے جمع کر کے تیرے قدموں میں ڈالنے کے لئے لایا ہوں۔"

تو غلوق اور چغتائی سرداروں کی آنکھوں میں بے پناہ حرص کی موروثی چمک نمودار ہوئی اور تیمور کے رفیقوں نے ان چرمی تھیلوں کے دہانے کھول دیئے جن میں جواہر، زیورات، طلائی زیورات، خزانے کے خزانے تھے قیمتی سمور خیمے کے فرش پر بکھیر دیئے۔ کمخواب اور اطلس کے تھان اور طرح طرح کے ریشم جو فرنگ سے ماوراالنہر کے شہروں میں آئے تھے۔ چغتائیوں کے قدموں پر ڈال دیئے، اور جب انھوں نے خیمے کا پردہ اٹھا کے اونٹوں پر لدے ہوئے قالینوں کے ڈھیر چاندی کے ظروف کے انبار دکھائے تو تو غلوق اور اس کے امیروں کو یقین آگیا کہ اب برلاسوں کے پاس سوائے ان کے کھیتوں، ان کے محلوں کی دیواروں اور ان کے خیموں کے اور کچھ نہیں رہا۔

"تو نے اور کسی کو کوئی تحفہ دیا؟" تو غلوق کی مکار، خوفناک آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔

تیمور نے اُسی بے خوفی اور بے تکلفی سے جواب دیا: "صرف تیرے تین سرداروں کو۔ ایک جو مجھے شہر سبز میں ملا اور جس نے مجھ تک پہنچنے کا پروانہ دیا۔ دوسرے دو اور سردار جنھوں نے مجھ تک پہنچنے کا راستہ روکا۔"

تو غلوق نے بگڑ کر کہا: "یہ یاسائے چنگیزی کے خلاف ہے کہ انھوں نے تجھے ستایا، اور خان کے حصّے سے مال لیا وہ کتے ہیں لیکن میرے کتے ہیں۔ اور ان کے لالچ سے میں اس قدر تنگ ہوں جیسے آنکھ کے دیدے میں بال پڑ جائے یا جیسے زبان میں پھانس چبھ جائے۔" پھر اس نے حکم دیا کہ وہ مال ان مغل سرداروں سے چھین کے حاجی برلاس کو بھیجا جائے۔ وہ تیمور کو ماوراالنہر یا شہر سبز کے علاقے کا واحد سردار نہیں بنانا چاہتا تھا، نہ وہ یہ چاہتا تھا کہ برلاسوں اور تاتاریوں کی باہمی رقابت اور خانہ جنگی کم ہو۔ اور تیمور نے یہ اسی وقت سمجھ لیا جب اُسے

محض تومان باشی بنایا گیا۔ ہزار سواروں کا سالار۔ اور شہر سبز کا حاکم۔ اور پھر جیسا کہ مغل چغتائیوں کا قاعدہ تھا، گرمیاں گذارنے کے لئے ان کا لشکر دیکھتے دیکھتے تر خطا دشتن کی پہاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

۵

تیمور نے اپنے خیمے میں لیٹے لیٹے گرم سمور کی تہہ کے اندر خانہ جنگی کے وہ تین سال یاد کیے جو کل کی بات معلوم ہوتے تھے۔ چغتائیوں کی واپسی کے بعد حاجی برلاس ہرات سے واپس آیا۔ اور بایزید جلائر خجند سے سمرقند آیا۔ اور سلطان حسین کابل سے آیا۔ اور اس کے ساتھ اولجائی آئی۔ اور اولجائی کے ساتھ جہانگیر آیا جو غوں غاں کرنے کے بجائے کچھ لفظ فارسی میں اور کچھ لفظ الغوری میں تتلا تتلا کے بول لیتا اور اس کو دیکھ کر تیمور کو اتنی خوشی ہوئی جتنی شہر سبز اور قرشی کو چغتائیوں کے ہاتھ سے بچا کے بھی نہ ہوئی تھی۔

اور پھر اسے غداری کی وہ شام یاد آئی جب اس کے چچا نے اسے قتل کرنے کی سازش کی تھی۔ سمرقند کی وہ خنک شام جب حاجی برلاس کے محل میں ہر طرف خربوزوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی اور باغوں میں فوارے چل رہے تھے۔ اور گرم گرم کبابوں کی مہک پھولوں کی خوشبو سے کچھ کم نہ تھی۔ تیمور پہلے ہی کھٹکا تھا کہ اس

پاس مسلح سوار کیوں پھر رہے ہیں لیکن دسترخوان بڑی نفاست سے چنا ہوا تھا۔ حاجی برلاس کے ساتھ ہرات سے کئی باورچی آئے تھے جو کھانوں میں فلفل ہندی اور دوسرے ایسے مسالے ڈالتے تھے جن کا کسی نے سمرقند میں نام بھی نہ سنا تھا، اور جن کی خوشبو بڑی گرم تھی۔ مگر حاجی برلاس زہر کھلانے والا چچا نہ تھا۔ وہ برلاس ترک، اور قتل کے لئے وہ تلوار ہی استعمال کرتا زہر نہیں۔

دسترخوان پر اس کے قریب بایزید جلائر بیٹھا تھا، جو بہت زیادہ کومیس پی گیا تھا اور نشے سے بدمست ہو رہا تھا اور اس نے جھک کر تیمور کے کان میں سرگوشی کی۔

"بھاگ یہاں سے بھاگ۔ تیرے سر پر قضا کھیل رہی ہے۔" یہ کہہ کے مدہوشی کے عالم میں بایزید جلائر نے قہقہہ لگایا۔ تیمور نے جو ذرا نظر اٹھائی تو جو خادم لور چھل چھل رہا تھا۔ وہ مسلح تھا۔ تیمور نے جلدی سے لقمہ کے ساتھ ایک نوکدار سی ہڈی اٹھائی اور ہڈی سے اپنے نتھنے کو کھروچ لیا۔ کوئی اس کی طرف دیکھ تو نہیں رہا تھا۔ کوئی نہیں اس نے اپنے نتھنے پر ایک اور زخم لگایا اور دوسرے ہاتھ سے پونچھ کے دیکھا تو تھوڑا تھوڑا خون بہنے لگا تھا۔ اس نے حاجی برلاس کی طرف نظر جھکا کے دیکھا۔ اور ایسی آواز میں جس سے ذرا بھی شک یا ہراس ظاہر نہ ہو، ذرا سعادت مندی کے لہجے میں کہا: "چچا میری نکسیر پھوٹی ہے اجازت ہو تو حوض میں دھو آؤں اور سر پر ذرا سا ٹھنڈا پانی ڈال لوں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا تو موت کے فرشتوں کو شک نہیں ہوا، وہ مطمئن تھے کہ سر پر ٹھنڈا پانی ڈال کے پھر واپس آئے گا خوب کھائے گا خوب کومیس پئے گا اور پھر اطمینان سے۔

اس نے حوض کا رخ کیا، جہاں [illegible] ہتھیار باندھے کھڑے تھے۔ ایک مسلح سپاہی کا ہاتھ مروڑ کے اس کی تلوار پیچھے سے چھینی اور اسے قتل کیا۔ اپنے گھوڑے کی رسی کاٹی اور جب وہ دروازے سے باہر نکل چکا تو چند لمحوں کے بعد اس نے اپنے پیچھے تعا

مقدّس درخت کی پوجا کسی اور ملک میں کیا کرتا جہاں زہرہ حسن کی دیوی کا مندر تھا۔ اس کی رگوں میں صحیح النسبی کا خون تھا، جو فرات کے کنارے اس سے پہلے بھی بہایا جا چکا ہے اس کے ہاتھ میں عصائے شاہی تھا، اور اس کے سر پر تاج تھا، اور اس لئے اس کے سر، اس کے عصا اور اس کے تاج کی قیمت تھی۔

یہ ویران مینار کسی زمانے میں کسی مسجد کا مینار ہوگا۔ مگر مسجد کب کی منہدم ہو چکی تھی۔ ان صدیوں کی شطرنج میں قزل قم پر بھی شمال کے وحشی ترکوں اور مغلوں کا قبضہ ہو جاتا اور کبھی جنوب کے ہل چلانے والے سیل جوتنے والے کلمہ پڑھنے والے ترکوں اور ایرانیوں کا، اور اس ویران مینار سے اگر کوئی چیز نظر آتی تھی تو اس لق و دق سُرخ ریت اور سُرخ ٹیلوں کے سمندر میں ایک چھوٹا سا نخلستان جس کے کنارے اونچی اونچی گھاس اگ آئی تھی۔ اور کچھ خاک آلودہ ٹھٹھرے ہوئے پستہ قد درخت تھے۔

آخری شکست کو پانچ چھ روز گذر چکے تھے، تیسرا دن تھا کہ روٹی کا آخری سوکھا ٹکڑا ختم ہو چکا تھا۔ اور اس تین دن کے عرصے میں سلطان حسین کے جسم کی چربی بہت کچھ پگھل گئی تھی، اس کی داڑھی کے بال دفعتاً سفید ہونے لگے تھے، اس کے سر کے بال وحشیوں کی طرح اُلجھ گئے۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئی تھیں، اس کے زرتار لبادے پر میل کے بڑے بڑے دھبے تھے رات کو گرمی سے اور گرمی سے زیادہ خوف سے لحہ لحہ وہ چونک چونک پڑتا۔ وہ بار بار چشمے پر جاتا، وضو کرتا، اور نمازیں پڑھتا، مگر اس کے دل کو تسلی نہ ہوتی۔ اس سے پہلے بھی اس نے مصیبتیں جھیلیں تھیں، کبھی دیبا و حریر کے بستر پر حسین حوروں کے ساتھ اور کبھی حسین ترو لشاد کے ساتھ راتیں گذاری تھیں، اور کبھی تپتے

کرنے والے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سُنی۔ لیکن سمرقند کی گلیوں میں تعاقب آسان نہیں تھا۔

گھر پہنچ کے اس نے اولجائی سے کہا: "تیرا چچا بھی سازش میں ضرور شریک تھا، پھر معلوم نہیں کیوں اُس نے مجھے خطرے سے آگاہ کیا۔ اُس نے میری کان میں سرگوشی کی بھاگ یہاں سے بھاگ۔"

اولجائی نے کہا: "یہ نشہ کی شرافت ہوگی، اس کی نہیں۔"

"اب اس شہر میں ہمارا گذر نہیں۔ بھاگ یہاں سے بھاگ۔ تیرے چچا نے غلط نہیں کہا۔"

"کہاں شہر سبز؟"

"تمام برلاس میرے چچا حاجی برلاس کے ساتھ ہیں" اور مجھے غدار اور چغتائیوں کا دوست سمجھتے ہیں۔ شہر سبز میں بھی بچاؤ کی صورت نہیں۔"

اولجائی کی آنکھیں ذرا ذرا چوڑی ہو گئیں۔ اس نے بلغم رنگل کے پوچھا۔ "پھر کہاں؟"

"تیرے بھائی سلطان حسین کے پاس جو بلخ کی پہاڑیوں میں اپنے لشکر کے ساتھ میرا انتظار کر رہا ہے اس نے مجھے اپنے ساتھ آملنے کا پیغام بھیجا ہے۔

[تیمور نے یہ سب کچھ یاد کیا۔ کس طرح ان دنوں اس کی قسمت سلطان حسین سے منسلک تھی۔ لیکن آج اولجائی شہر سبز کے ایک باغ میں مٹی کے نیچے ابدی نیند سو رہی ہے۔ اور پھر اس نے ایام میں تسلسل کی تلاش کی۔]

[یہ ساری یاد ایک زہر خند تھی۔ یہی تیمور کی یادداشت اور اولجائی کی یادداشت کا فرق تھا۔ تیمور کی یادیں کسی طرح کی آرزو کا شائبہ نہ تھا۔ کوئی تمنا شامل نہ تھی۔ یہ جنگل کے خطرے، شکاری جانور کی چاپ، پتوں کی کھڑکھڑاہٹ، جلتی ہوئی ریت کی یاد تھی، قزل قم اور قراقم کے لال اور کالے ریگستانوں کی یاد]

اور پھر جب جلائر اور برلاس آپس میں لڑ رہے تھے اور سازشوں کا بازار گرم تھا۔ تو غلوق خاں افق پر نمودار ہوا۔ خان تنگری کی ٹھنڈی برفانی چراگاہوں میں گرمیاں گذار کے جاڑوں کے شروع میں اس نے پچھم کارخ کیا۔ اس کے پستہ قد تیز قدم ٹٹوؤں، اور ان سے لدے ہوئے ریوڑوں نے ایسیک کول کی جھیل کا ٹھنڈا نیلا نیلا پانی پیا، اور صنوبر سے لدے ہوئے پہاڑوں سے اتر کے کھیتوں اور لہلہاتی چراگاہوں میں پھر فرغانہ کی وادی سے ہوتے ہوئے قزل قم کے لال لال ریگستانوں میں مغلوں کا اژدہام مور و ملخ کی طرح چھا گیا۔

قضاو قدر کی طرح ایک ایک کر کے تیمور کے دشمن مغلوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترے۔ بایزید جلائر کے قتل کا حال سن کے اولجائی رو رہی تھی۔ اور تیمور کے چہرے کو بے حس دیکھ کے اس نے کہا تھا۔ "میں نے مانا میرا چچا بایزید تیرا دشمن تھا۔ مگر شریف دشمن تھا، اسی نے تجھے تیرے چچا کے فریب سے آگاہ کر کے تیری جان بچائی تھی....."

اس پر تیمور سے نہ رہا گیا اس نے کہا تھا: "شکریہ۔ پہلے تو تو کہتی تھی کہ اسے نہیں بلکہ توران کی تومیس نے اور ایران کی انگوری شراب نے میری جان بچائی تھی"۔

"اب تو شرابیوں کی ایسی باتیں کر رہا ہے"۔ اولجائی جھنجھلا گئی تھی

"شراب کی فضیلت سے مجھے انکار نہیں۔ وہی بایزید جب نشے میں غصے سے بول رہی تھی اور تجھے یاد ہے جب میں نے تجھ سے کہا تھا کہ تیرے چچا نے ہی خطرے سے آگاہ کیا تو تو خود بول اٹھی تھی کہ یہ نشہ کی شرافت ہو گی۔ اس کی نہیں"۔

"مجھے یاد ہے"۔ ذرا لاجواب ہو کے اولجائی نے کہا "مگر جب تیرا چچا زندہ تھا۔ اور میں جو چاہتی کہہ سکتی تھی۔ اب تو وہ مر گیا"۔

[یہ اولجائی کی عادت تھی۔ اور تیمور کی سخت اور خشمگیں آنکھوں سے اس کی یاد

میں ایک ایک قطرہ ٹپک پڑا۔ ناممکن تھا کہ اولجائی دشمن کو تہ دل سے معاف نہ کرے اور مرے ہوئے دشمن کو تو وہ دوست سمجھتی تھی!

اور پھر تیمور کو اپنے چچا حاجی برلاس کی موت یاد آئی۔ کیسی کمینی موت۔ بزدلی کی موت، وہ موت نہیں جو مغلوں سے لڑتے میں میسر آتی ہے۔ تلوار کی، تیر کی، نیزے کی موت نہیں۔ قراقم کے کالے ریگستانوں میں سفید بھیڑ کے اون کے بھیس میں چوروں کے ہاتھ قتل۔ اس واقعہ کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے قاضی زین الدین نے لکھ بھیجا تھا جس نے سارا قصہ حاجی برلاس کی ترکمان کنیز کی زبانی سنا تھا۔ آدھی رات کو ترکمان کنیز کی آنکھ کھلی تو اس نے عجب تماشا دیکھا۔ یہ کہ ایک بڑا اونچا سیاہ فام سا آدمی جس کے سینے پر گھنے بال تھے، اور جو کمر تک ننگ دھڑنگ تھا، اپنے منہ پر صافہ لپیٹے ایک بڑا سا پتھر اپنے ہاتھ میں لئے حاجی برلاس کے سرہانے دوزانو ہو بیٹھا تھا کہ اگر وہ ذرا بھی حرکت کرے تو وہ پتھر سے اس کا سر کچل دے۔ اور دوسرا چور بڑے اطمینان سے اس کے سمور سمیٹ رہا تھا، اور اس صندوق کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا جس میں سونے اور جواہر کے کیسے رکھے تھے۔ مارے خوف اور بے چینی کے حاجی برلاس کے اعصاب کھنچے جا رہے تھے، اور اندھیرے میں بھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ خوف سے اس کی آدھی جان نکل چکی ہے۔ باہر برلاس سپاہی غافل سو رہے تھے۔ ترکمان کنیز نے پہلے چیخنا چاہا، مگر پھر آنکھ ذرا سی کھلی رکھی اور سوتی بن گئی۔ اسے یقین تھا کہ مال اسباب لینے کے بعد یہ چور اسے بھی پکڑ لے جائیں گے۔ اتنے میں باہر آہٹ ہوئی اور حاجی برلاس نے جھپٹ کے اپنا خنجر کمر بند سے نکالنا چاہا۔ بڑا سا پتھر پوری طاقت سے چور کے ہاتھ سے نکل کے اس کے سر پہ آگرا۔ ترکمان کنیز نے خون کی سرخی اور بھیجے کی سفیدی کا ملا جلا ملغوبہ بہتا دیکھا اور مارے کراہت اور خوف کے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر جو اس نے آنکھیں کھولیں۔ تو نہ چوروں کا پتہ تھا

سونے اور جواہر کے صندوق کا۔ حاجی برلاس کی لاش البتہ اسی کے قریب اسی طرح پڑی تھی اور قالین کے نیلے نیلے پھولوں پر سُرخ اور سفید مغز بہ ابل ابل کے پھیل گیا تھا۔ اب کے وہ بہت زور سے چیخی اور سپاہی اندر آ گئے۔

۶

اور پھر تیمور نے یاد کیا کہ اس کے دشمنوں کے بعد اس کے دوستوں کی باری تھی کیونکہ اس کے دوست اور اس کے دشمن دونوں چغتائی مغلوں کے دشمن تھے۔ اس نے اور اولجائی نے سلطان حسین کو کہتا سمجھایا کہ مغل بہت طاقتور ہیں۔ ان سے لڑنا بیکار ہے۔ کابل واپس جانے ہی میں سلامتی ہے۔ مغل ماوراالنہر کو تاراج کر کے واپس چلے جائیں گے خواہ مخواہ کابل پر حملہ نہ کریں گے اور کابل بہرحال چغتائیوں کا علاقہ نہیں ایلخانوں کا علاقہ ہے اور جلائر ہونے کی حیثیت سے سلطان حسین کا حق ہے کہ ایلخانوں کی سرزمین پر حکومت کرے لیکن ہمیشہ کی طرح کبھی سلطان حسین اس کی باتیں مانتا تھا اور کبھی نہیں مانتا تھا

[بے چینی سے تیمور نے قید ہی سلطان حسین کی پرانی رفاقت یاد کی ہاں اس نے اور اولجائی نے سلطان حسین کو بہت سمجھانا چاہا مگر بے سود۔ سلطان حسین نے اسے طعنہ دیا: میں چنگیز اور ہلاکو کی اولاد سے ہوں، اور بادشاہت میرا حق ہے۔ تو برلاس ہے، ترک ہے، نوکر ہے۔ تیرے لیے برابر ہے کہ میرا نوکر بنے یا تو خود

خان کا۔ میں اور تو غلق تلواروں کا پھل ہیں جو ایک ہی درخت سے آگے ہیں، وہ چغتائی خاں کی شاخ پر ہے اور میں ہلاکو خاں کی شاخ پر۔ دو تلواریں ایک میان میں رہ نہیں سکتیں۔ رہ گیا تو۔ تجھے تو بہر حال کسی نہ کسی کی خدمت کرنا ہے۔

تیمور کو یہ سن کے بڑا طیش آیا تھا۔ مگر اولجائی کو اور زیادہ غصہ آیا۔ اور اس نے کہا تھا کہ "بھائی اگر تو چنگیز اور ہلاکو کی اولاد سے ہے تو کیا میں ان کی اولاد سے نہیں؟ اور اگر میں ان کی اولاد سے نہیں تو پھر تیری بہن کیسے ہوئی؟"

سلطان حسین نے جھنجھلا کے کہا "عورتوں کی نرالی منطق ہے۔ تیرے رشتے سے تیمور کیسے شاہزادہ ہو گیا؟

نرالی منطق نے جواب دیا "شاہزادہ نہ سہی، لیکن وہ گورگاں ہے۔ چنگیز کے خاندان کا داماد ہے۔ اسے تم نے نوکر کیوں کہہ دیا۔ اگر وہ بجائے عقار اساتھی ہونے کے چنگیز خاں خان اعظم کے زمانے میں پیدا ہوتا تو ترخان بنایا جاتا اور ترخانوں کا سردار ہوتا۔"

کیا گورگان نوکر نہیں ہوتے۔ آسائے چنگیزی کے مطابق ہر وہ شخص جو خان نہیں خان کا نوکر ہے مثلاً میرا سگا بھائی بھی میرا نوکر ہی ہوتا۔"

اور اولجائی نے غضب ناک ہو کے کہا تھا "تیری بہن ہونے کے بجائے اگر میں تیرا بھائی ہوتی تو میں بھی دیکھتی کہ تو میرا نوکر بنتا ہے، یا مجھے نوکر بناتا ہے۔"

اس پر سلطان حسین اٹھ کھڑا ہوا، اس کا بھاری بھرکم جسم اطلس اور کمخواب کے لبادے میں سچ مچ بادشاہ کا پیکر معلوم ہو رہا تھا اور اولجائی نے اس لڑائی کے عالم میں بھی فخر سے اس کی طرف دیکھا کہ وہ اس کا بھائی ہے۔

اور سلطان حسین نے شاہانہ تمکنت سے تیمور کے شانے پر ہاتھ رکھ کے کہا "تیرے لیے برابر ہے کہ تو میرا ساتھ دے یا تو غلق خاں کا۔ تو چغتائی خاندان کا ساتھ دے گا

ایلخانوں کا۔ یہ یاد رکھ کہ تیری شادی ایلخانیوں میں ہوئی ہے۔ ایلخانی رسول اللہ پر ایمان لے آئے ہیں اور چغتائی ابھی تک نیلے جادو والی آسمان کو پوجتے اور مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں۔"

تیمور اٹھ کھڑا ہوا، سرو قد، اس کی چوڑی سفید، بلند پیشانی پر غصے اور حرارت سے پسینے کے قطرے جگمگا رہے تھے اور اس نے اپنی لانبی نوکدار تلوار زمین پر ٹیکی اور خشونت کے لہجے میں اپنے برادر نسبتی سے کہا: "میں گورگاں ہوں کسی کا نوکر نہیں۔ اگر تم نے توغلوق خاں سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تو خدا تمھیں ظفریاب کرے۔ میں کسی کا ساتھ نہیں دونگا۔ نہ تمھارا اور نہ توغلوق خاں کا۔ میرے لئے شہر سبز کا رستہ کھلا ہے جہاں میرے باپ کی ہڈیاں دفن ہیں۔"

سلطان حسین کے لہجے میں استہزا کی خفیف سی جھلک تھی۔ جب اس نے کہا تھا "تو کیا تمھارا ارادہ تارا گائی کی جگہ خانقاہ میں صوفی بن کے بیٹھنے کا ہے۔ مگر کافر چغتائی صوفیائے کرام کی کوئی قدر نہیں کرتے۔ وہ خانقاہوں کو اپنے گھوڑوں کا اصطبل بناتے ہیں۔"

تیمور شانے ہلا کے خاموش ہو گیا۔ لیکن جب سلطان حسین خیمہ کا پردہ ہٹا کے باہر نکل رہا تھا تو تیمور نے کہا: "بھائی خدا تمھیں ظفریاب کرے۔ میں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس وقت صوفی بنوں گا جب میری فولادی تلوار کو زنگ لگ جائے گا۔ اور تیمور جو خود لوہا ہے اس کی تلوار کو مشکل سے زنگ لگتا ہے لیکن ہر چیز کا وقت ہوتا ہے۔ ابھی اس کا وقت ہے کہ میں دیکھوں کہ ہوتا کیا ہے۔"

شہر سبز میں جب تیمور نے توغلوق خاں کے ہاتھوں سلطان حسین کی شکست فاش کی خبر سنی تو اسے صدمہ ہوا۔ اسے اس کا بھی رنج تھا کہ کاش اس نے سلطان کا ساتھ دیا ہوتا۔ لیکن اب بہر حال اسے اپنی غیر جانبداری کا انعام

وصول کرنے جاتا تھا۔

اور کوچ سے پہلے کی رات، اندھیری اندھیری، مٹیالی مٹیالی سی تھی، جس میں شہر سبز کے کچے مٹی کے مکانوں میں دیئے جگنوؤں کی طرح جگمگا رہے تھے چنار کے ایک پرانے قد آور درخت کے نیچے بیٹھا۔ تیمور اپنے ساتھیوں کو کوچ کے آخری احکام دے رہا تھا، اس حالت میں بوڑھا قاضی زین الدین، ایک ہاتھ میں زیتون کے تیل سے روشن چراغ، اور دوسرے ہاتھ میں تسبیح لئے آ کے اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اور تیمور کے سلام کا اس نے بڑے کرخت لہجے میں جواب دیا۔

تیمور نے اس کی طرف گردن اٹھا کے دیکھا اور اپنے ساتھیوں کو جلدی جلدی رخصت کیا۔ ان کے جانے کے بعد قاضی زین الدین ایک ٹھنڈی آہ بھر کے سفید سمور کے فرش پر بیٹھ گیا۔

"منگ باشی امیر تیمور برلاس"

تیمور نے اس کی طرف استفہامیہ نظر سے دیکھا۔

"مجھے کچھ پوچھنا ہے"

بہت کم قاضی زین الدین نے اس لہجے میں بات چیت کی تھی۔

"پوچھئے"

"آج تک کسی چٹان سے کبھی دودھ کے فوارے ابلے ہیں؟"

"نہیں"

"آج تک کسی شیرنی کو بھیڑ بکری کے بچے پر رحم آیا ہے؟"

"نہیں"

"فرغانہ کی چراگاہوں میں آج تک بجائے پانی کے کبھی خون کی بارش سے سبزہ اگا ہے؟"

"نہیں۔"

"اگر نہیں تو پھر تم سمرقند جاؤ اور عزور جاؤ۔ اور تو غلوق خاں سے کہو کہ چٹان سے دودھ نکالے اور شیرنیوں کے بھٹ میں میمنوں کو جھونک دے اور مرغزاروں کی آبیاری کے لئے خون چھڑکے۔"

وہ اوہام پرست جو بہادر تیمور کے سائے میں کہیں چھپا بیٹھا تھا، گھبرا گیا۔ "آپ کا مطلب؟"

"کچھ نہیں۔"

قاضی زین الدین زمین پر ہاتھ ٹیک کے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جھک کے اس نے وہ چراغ اٹھایا جو زیتون کے تیل سے روشن تھا۔

"زین الدین بابا" تیمور نے پھر ایک بار اسے مخاطب کیا۔

"کیا ہے؟"

"میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے، جب وقت آجائے گا تو مطلب خود بخود سمجھ میں آجائے گا۔"

لیکن صبح کو تیمور نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔ وہ اپنے مختصر سے دستے کے ساتھ تو غلوق خاں کی قدمبوسی کے لئے سمرقند روانہ ہوا۔

۷

[یاد پھر ایک زہر خند بن گئی] کیا یہ وہی سمرقند تھا جو موسم سرما میں اس نے حاجی برلاس کی سازش کے خوف سے چھوڑا تھا۔ صرف چند مہینے پہلے۔ اس کے باغوں کے درخت بچے ہوئے تھے۔ اس خزاں میں چناروں تک کو یاد نہ رہا تھا کہ لہلہا کے آگ کے شعلوں کی طرح سُرخ ہو جائیں۔ کیونکہ چناروں تک کی پتیاں گھوڑوں اور دو کوہانوں والے اونٹوں کی خوراک بن چکی تھیں۔ وہ اور آگے بڑھا مغلوں کے بدبودار سموروں کے لبادوں کی بو سونگھتا اور ان کے گھوڑوں کی لید کے انباروں کو دیکھتا ہوا۔ اس مرتبہ مغل سردار اُسے کھلم کھلا مغلظات سنا رہے تھے اور یہ سب سنتا ہوا لاچار و مجبور قیدیوں کے دستے کے قیدی سردار کی طرح تغلق خاں کی سرائے کو جا رہا تھا۔ جہاں امیر کازغان کا محل تھا۔ اس محل کے باغ میں تغلق خاں کا روپہلا خیمہ تھا۔ خیمے کی روشیں ویران تھیں۔ پھولوں کے تختے کچلے جا چکے تھے۔ محل جل کر خاکستر ہو چکا تھا، اور اس کی لکڑیاں تک ہیزم بن چکی تھیں۔ یہ جو منظ

ہوئے پتھروں پر سر رکھ کر، گرم ریت کے بستر پر۔ لیکن اور ہر مرتبہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ خواب ٹل جائے گا، مگر اس مرتبہ ٹلتا نظر نہ آتا تھا، اُسے خدائے ذوالجلال سے نرم نرم سا شکوہ تھا جس نے یہ تاروں بھری رات بنائی تھی، اور ریت کے ان چمکدار ذرّوں کے درمیان نگینے کی طرح اس نخلستان کو جڑا تھا، کہ اس کی قسمت کیوں کھوٹی نکلی، جب کہ اس کا خون کھرا تھا۔ اپنے ساتھ اپنی قسمت کی غدّاری کا احساس تیمور کی غدّاری اور نمک حرامی کے احساس سے کہیں زیادہ سخت تھا، اس کی کنپٹیوں کی رگیں چربی کی تہوں کے اندر دھڑک دھڑک کر فریاد کر رہی تھیں، اور اس فریاد میں بھی ایک شاہانہ جاہ و جلال تھا۔ اس شکست میں ایک جارحانہ ملامت کا انداز تھا، اور اس ملامت کا نشانہ تمام کون و مکان تھے یہ دشت و در، یہ پہاڑ یہ وادیاں، اور ان کے پرے بدخشاں کے لعل، اور ختن کے غزال اور خیبر کے جنگجو سب اس سے منہ موڑ چکے تھے۔ سب غدّاری کر چکے تھے۔ آسمان پل صراط کی طرح سمٹ کر ایک تلوار کی دھار بن چکا تھا، اور سمٹ کر چمکتے ہوئے تاروں کو اوپر کی ظلمت کے حوالے کر کے اس کے قدموں کے نیچے آچکا تھا کہ اس کے دو ٹکڑے کر کے اسے نیچے قعرِ جہنم کی بے پناہ گہرائیوں میں گرا دے۔ اور اب بھی سلطان حسین کے دل میں تاسّف نہ تھا، افسوس تھا اور حسرت تھی۔ صرف وہ مظلوم تھا، اور ہر شخص، ہر شے، تقدیر، تدبیر ہر شے ظالم تھی۔ اسے یاد نہ رہا تھا کہ اس نے بھی شب خون مارے ہیں، کیونکہ ایسی باتیں اس آخری وقت کے خشوع و خضوع میں یاد نہیں آتیں۔ نہیں اب ساری کائنات ظالم تھی، اور صرف وہی مظلوم تھا۔

جب بھوک کا تیسرا دن گذرا اور چوتھا دن آیا، اور سوائے پانی اور درخت کے پتوں کے، جن کا چبانا تک ممکن نہ تھا۔ اور کچھ نہ رہا تو صبح کی سنہری بھوکی

کنیزیں مغلوں کے خیمے میں ماری پھر رہی تھیں، سمرقند کے برلاسوں، تاتاریوں اور ترکمانوں کے شریف ترین گھرانوں کی دوشیزائیں تھیں۔ جس طرف سے وہ گذرتا وہ اُسے دیکھ کر منہ پھیر لیتیں۔ اور اس مرتبہ جب تیمور توغلوق خاں کے سامنے پہنچ کے مغل انداز میں کورنش بجالایا تو توغلوق خاں نے اسے بیٹھنے تک کو نہیں کہا:

اس مرتبہ اس نے سچ مچ اپنے آپ کو نوکر محسوس کیا۔ ماوراالنہر کی ساری آبادی کی طرح وہ بھی حقیر تھا، محکوم تھا غلام تھا

بڑی کرخت آواز میں توغلوق نے کہا: "تیرے چچا حاجی برلاس نے ہم سے بغاوت کی"

"خان اعظم۔ وہ میرا بھی دشمن تھا" تیمور نے جواب دیا۔

"ہمیں معلوم ہے"

اب اس کے سامنے کوئیس کا بڑا سا سفالی جام اور اُبلے ہوئے گوشت کی ایک قاب رکھی گئی اور توغلوق خاں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس نے اپنی پیشانی سے توغلوق خاں کے قدموں کے پاس کی زمین چومی اس کا خون غصہ سے کھول رہا تھا جس سمرقند کو وہ آنا چاہتا تھا وہ یہ سمرقند نہیں تھا۔

"تیرے برادر نسبتی سلطان حسین نے ہم سے بغاوت کی" کرخت الغوری میں توغلوق خاں کی آواز پھر گونجی۔

"میں نے اسے بہت روکا" تیمور نے ابلے ہوئے گوشت کا لقمہ چباتے ہوئے جواب دیا۔

"ہمیں معلوم ہے۔ ہمارے مخبروں نے یہی خبر دی" اب توغلوق خاں کا لہجہ ذرا نرم تھا۔

اس نے پھر پوچھا: "امیر حسین اب کہاں ہے؟"

"خان اعظم مجھے معلوم نہیں۔"

اس نے ایک ہڈی چبائی اور کومیس کا ایک گھونٹ پیا۔ اس کو اس طرح کھاتے دیکھ کر تو غلوق خاں نے اطمینان سے ڈکار لی۔

تو غلوق خاں نے اپنے بیٹے الیاس خواجہ اوغلان کو مخاطب کر کے کہا "سمرقند کے برلاسوں کا کوئی اعتبار نہیں۔"

کئی چغتائیوں نے اس کا جملہ دہرایا "کوئی اعتبار نہیں" اور تلواریں کھڑکھڑائیں۔

ایک سمرقندی غلام، آفتابہ لایا۔ تیمور نے غور سے دیکھا تو وہ سید بدرالدین تھا جو امیر کازغان کے مقربین میں سے تھا، اس کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر تھی تیمور نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور ہاتھ دھو کے کلی کی، منہ میں انگلی ڈال کے دانت صاف کئے اور ڈکار لے کے "الحمد للہ" کہا اور کھانے کی تعریف کی۔

اس کے بعد تو غلوق خاں کی گرجدار آواز بلند ہوئی۔ اس نے پکارا "بکی جوک بہادر" اس کا سپہ سالار۔ بکی جوک آگے بڑھا۔ تیمور نے اس کا ذکر بہت سنا تھا، اب اسے غور سے دیکھا۔ گول منگول چہرہ، زرد زرد رنگ، پتلی چھوٹی سی داڑھی، بچھو کے الٹے ہوئے ڈنک کی طرح لٹکتی ہوئی مونچھیں، چھوٹے چھوٹے پاؤں، مگر بڑا چوڑا اور مضبوط سینہ۔

"راوی سے کہو کہ ہمارا پریغ سنائے۔"

بکی جوک نے سر بہ سجدہ ہو کے تو غلوق خاں کے قدموں کے قریب کی زمین چومی۔ اور جب وہ اٹھا تو راوی نے اس کے ہاتھوں سے چینی ریشم پر لکھا ہوا الغوری فرمان لے کر چوما اسے بڑے ادب سے کھولا۔ اور پڑھنا شروع کیا۔

یہ پریغ ہے تو غلوق خاں خان اعظم چنتائی کی۔ یہ فرمان بیت پاک والوں اور قزل قم اور قراقم کے رہنے والوں کے لئے واجب التعمیل ہے۔ یہ پریغ سمرقند

کی اولاد سے ہے۔ میں نے اپنے اور اس کے عزیزوں کا ساتھ نہیں دیا۔"

"ہمیں معلوم ہے۔ تو غلوق خاں نے کہا: "اسی لئے ہم نے تجھے سمرقند کا حاکم مقرر کیا۔ حالانکہ ہماری اردو کے نوکروں کو سمرقندی عورتیں پسند ہیں، اور سمرقند کے باغوں کے میوے پسند ہیں۔"

تیمور کا خون غصہ سے کھولنے لگا مگر وہ خاموش رہا۔ اور تو غلوق خاں نے کہا: "رہ گئی یہ بات کہ تو چنگیز خاں کے خاندان کا داماد اور گورگان ہے۔ یہ بھی ہمیں قبول ہے۔ لیکن کیا تجھے اپنے جدّ امجد کیولی خان کا وہ پیمان یاد ہے جو اس نے چین کے خان اعظم قبلائی خاں سے کیا تھا، جو خان اعظم چنگیز خاں کا پوتا تھا اور تیرا جدّ امجد کیولی خاں چنگیز خاں کے خاندان کا داماد تھا۔ قبلائی خاں سے کیولی خاں نے یہ پیمان کیا تھا کہ بادشاہت چنگیز خاں کی اولاد میں رہے گی۔ اور گورگاں بادشاہت کا حق نہیں مانگیں گے، وہ چنگیز کے شاہی خانوادے کے نوکر رہیں گے۔"

راویوں نے تو غلوق خاں کی بات اٹھائی اور نعرہ لگایا: "من کے کو کو تینگری کی قسم کہ یہ بات سچ ہے" اور اس پیمان کا ذکر تمام پرانی داستانوں میں ہے۔"

تیمور نے آخری کوشش کی: "خان اعظم یہ سچ ہے کہ بادشاہت چنگیز خان اعظم کے خانوادے کا حق ہے اور نوکری ہم داماد وں اور گورگانوں پر واجب ہے۔ یہ میں مانتا ہوں۔ لیکن اس صورت میں صرف اپنے بیٹے الیاس خواجہ اوغلان کو میرا حاکم اعلیٰ بنا۔ بکی جوک بہادر تو محض ایک چغتائی امیر ہے میں جو شاہی خانوادے کا گورگاں ہوں۔ اس کی اطاعت کیسے کر سکتا ہوں۔"

بے صبری سے تو غلوق خاں نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اور راجہ کھڑا ہوا۔ "میں تو غلوق خاں، چغتائی خان اعظم، جو کہنا تھا، کہہ چکا۔ اب مجھے اور کچھ نہیں

کہتا ہے:"

اور راویوں اور نقیبوں نے صدا بلند کی "خان اعظم تو غلوق خاں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اس کی پر لفظ واجب التعمیل ہے۔"

تیمور نے پھر آستانے کی زمین چومی۔ اس کی آنکھوں میں زہر بھرا تھا اس لئے اس نے اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور الٹے پاؤں تو غلوق خاں کے نقرئی خیمے سے باہر نکل گیا۔

اور جب رات آئی تو اس نے قاضی زین الدین کی بات یاد کی، اور چپکے سے اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "چلو۔"

وہ سب سمرقند کے ایک ویران مکان میں جمع تھے انھوں نے پوچھا "کہاں؟"

"جہاں میری قسمت لے جائے۔ جہاں ہمارے خدا کی مرضی ہو۔"

۸

[تیمور کروٹیں بدلتا رہا اور یاد کرتا رہا]

ایک شاہ، ایک فرزیں اور بیس مہرے، بیس رفیق جو اس کے ساتھ تھے اور اس کی فرزیں اسکی فرزانہ ملکہ اولجائی ترکان آغا جو سیاہ لباس پہنے تھی جس کی دونوں چوٹیاں ہندوسند کے افعیوں کی طرح بل کھاتی جاتی تھیں۔ وہ اس غربت اس بے مقصد سفر میں بھی برابر ہنستی ہنساتی جا رہی تھی۔

"آج مجھے یقین ہے کہ سلطان سے ملاقات ہو گی" اس نے ایک بار بڑی شگفتہ ہنسی ہنس کر کہا۔

"یہ تو تو روز کہتی ہے جس دن سے ہم نے سمرقند چھوڑا ہے"

"روز جھوٹ موٹ کہتی تھی، آج سچ مچ کہتی ہوں۔ تیمور تمھیں معلوم ہے کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آج یہ بات ہو کر رہے گی۔ اس کی وجہ پوچھو تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر یقین سا ہوتا ہے کہ یہ بات آج ہو کر رہے گی۔ آج صبح جب میں

سو کر اٹھی، جب میں نے تمھیں نان اور کومیس دی تو اسی وقت سے مجھے یقین سا تھا کہ آج سلطان حسین ضرور ملے گا۔"

تیمور کا منہ فکر اور سوچ سے سوجا ہوا تھا۔ اس نے زور سے "ہوں" کہا۔

اس کی طرف جھک کے اولجائی ترکان آغا نے دیکھا۔ اور اس نے ایک لحظ کے لئے لگام کھینچ لی۔ اولجائی کے کانوں کے دونوں آویزے جو چینی موتیوں کے تھے جھولا جھولنے لگے، اس کی زلفیں سینے پر لہرا گئیں، اس کی آنکھوں میں محبت اور شرارت کی ملی جلی چمک تھی۔

[آج وہ خاک کے تلے ہمیشہ کے لئے سو رہی تھی]

وہ ہنسی۔ تو اس کے دانت موتیوں کی طرح چمکے۔ اور اس نے پھر پوچھا: "کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔"

"مرد ہمیشہ سوچتے رہتے ہیں۔ اور کبھی نہیں بتاتے کہ کیا سوچتے ہیں۔ زیادہ سوچو گے تو گھوڑا لگام توڑ کے بھاگ جائے گا۔"

تیمور کے چہرے کی سختی ذرا کم ہوئی اور وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

اطمینان سے اولجائی پھر زین پر تن کر بیٹھ گئی اور اس نے اور تیمور نے لگام کھینچ لی۔

"تیمور" اولجائی نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا۔

"میں سوچتی ہوں کہ ساری دنیا اس سرخ ریگستان کی جیسی نہیں ہے۔ ہرات کے قریب بڑے بڑے بھرے کھیت ہیں، اور سمرقند کے باغ خربوزوں سے لدے رہتے ہیں۔ فرغانہ میں نہریں بہتی ہیں اور ایسک کول کے کنارے پہاڑوں پر صنوبر و ل کے جھنڈ ہیں۔"

"اولجائی تو تھک گئی ہے، اسی لئے ایسی باتیں سوچتی ہے۔ ہمیں ہمیشہ اس

سرخ ریگزار میں پھرنا نہیں پڑے گا۔"

"ہاں کبھی نہ کبھی ہمارے دن پھریں گے۔" اولجائی نے کہا۔ تم میرے لیے شہر سبز میں ایک باغ بنوا دینا وہاں میں جہانگیر کے ساتھ رہوں گی۔ اور وہاں جہانگیر لکھنا پڑھنا سیکھے گا۔"

"پہلے اسے تیر اندازی اور لڑنا بھڑنا سیکھنا ہے۔" تیمور نے کہا۔

"خیر یہی سہی۔"

"اور میں اس باغ سے باہر نہ نکلوں گی۔"

[آج وہ ایک باغ میں ہمیشہ کے لئے گہری نیند سو رہی تھی، قزل قم کا بے پایاں سفر، بے انداز ہ آوارہ گردی ختم ہو چکی تھی۔ اور یہ یاد کر کے تیمور کا سینہ جل اٹھا اور اس نے گہری ٹھنڈی سانس لی۔]

تیمور نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ اور انگلیوں کی آڑ سے سورج کے مقام کا اندازہ کرنا چاہا۔ ابھی اور کتنا دن باقی تھا۔ معلوم نہیں رات ریت کے ٹیلوں پر ہی گذارنی پڑے گی یا کہیں کوئی نخلستان مل جائے گا۔ آسمان پر آفتاب بہت گرم تھا، اور سر پہ خود تپ رہا تھا۔ تیمور نے خود کو سر سے اتار کے کیسے میں رکھا اور سر پہ قراقل کی ادنی کلاہ پہن لی۔

پھر ایک ٹیلے سے اس نے ریگ اور پتھر کے اس سمندر کی طرف دیکھا، جسے قزل قم کہتے ہیں۔ ہر طرف لال لال ریت۔ زمین پر۔ ہوا میں۔ آسمان پر ہر طرف ریت کی سرخی۔ حالانکہ آسمان کا رنگ نیلا ہونا چاہیئے، اور ہوا کو بے رنگ ہونا چاہیئے۔ لیکن گرم ہوا کے جھکڑ ہر طرف لال لال ریت کو اڑا رہے تھے۔ زمین اس طرح تپ رہی تھی جیسے تنور پر کوئی نان کی جگہ مٹی کی ٹکیاں پکائے۔ اس بنجر ریت کے سیلاب اس طرح اٹھتے جیسے سمندر کی موجیں، ننھی ننھی ہزاروں لاکھوں کنکریاں، پانی کے قطروں کی طرح

بکھرتیں اور ٹیلوں کی پسلیاں کھود کے ان میں جذب ہو جاتیں۔ جہاں زمین زیادہ پتھریلی تھی، گرمی سے چٹانیں چٹخ گئی تھیں، کیوں کہ یہ صدیوں کی گرمی تھی، جسے سرما کا برف کبھی ٹھنڈا کر سکتا کبھی ٹھنڈا نہ کر پاتا۔

آفتاب نصف النہار کے قریب پہنچ رہا تھا اور ریت کے جھکڑوں سے ایک دھند سی پھیل گئی تھی، سرخ سرخ دھند جس میں ہزار قدم آگے کی چیز ایسے نظر آتی جیسے کسی دوسری دنیا میں ہو۔ آنکھیں معلوم ہوتا تھا کہ ابل پڑیں گی۔

ادلجائی نے اپنے سر پر کپڑا باندھا، اور ایلچی بہادر سے تھوڑا سا پانی مانگ کے اسے تر کیا۔ پانی کے کٹورے کی تہہ میں ریگ کے ننھے ننھے ذرّے بیٹھ گئے تھے۔ اس ریت کو پانی میں حل ہونا گوارا نہ تھا، معلوم نہیں ہوا میں کس طرح تحلیل ہو جاتی تھی۔

جیسے کسی اور دنیا میں کوئی خوشگوار سی لکیر ابھرے، ریت کی جھلستی ہوئی لال لال دھند کے اس پار کبھی کبھی کسی نیم خشک نخلستان کے کنارے سوکھی ہوئی گھانس کچھ دور تک نظر آتی۔ اور گھوڑے بے اختیار ہنہنانے لگتے۔ سب سے پہلے ایلچی بہادر اور اس کے بعد اور رفیق گھوڑوں کی مرضی کو مان لیتے اور لگامیں ڈھیلی کر دیتے۔ اور جتنی دیر گھوڑے گھانس چرتے خشک بے نم بے روغن گھانس کو میس کا ایک دور چلتا اور لدے ہوئے ٹٹوؤں کی پیٹھ سے خورجیاں اتار دی جاتیں جن میں خشک کیا ہوا نمک دار گوشت تھا۔ سب اس مزیدار گوشت کو چباتے۔ پھر بڑی احتیاط سے لدی ہوئی مشکوں سے پانی کٹوروں میں بھر بھر کے تقسیم کیا جاتا۔ پانی، کومیس اور گوشت دونوں سے زیادہ قیمتی تھا، کیونکہ اس گرمی میں پیاس بہت لگتی تھی۔ اور ٹھنڈے پانی کے چشمے یا سوکھی ہوئی ندیوں کی تہ میں نخلستانی سبزی کے ٹکڑے بہت دُور دُور تھے۔ اور گھوڑے اور باربرداری کے ٹٹو کومیس نہیں پیتے تھے۔ لیکن پانی کے بغیر ان کا گذارہ نہیں تھا۔

آج بھی ایسی ہی ایک لکیر نظر آئی۔ ایلچی بہادر نے اپنے گھوڑے سے استمزاج

کے لئے لگام ڈھیلی چھوڑی۔ اور گھوڑے نے اس سبز کمیر کا رخ کیا ہی تھا کہ ایلچی بہادر نے لگام پھر پوری قوت سے کھینچ لی، اور گھوڑا غصے اور کرب سے دانت نکال کے ہنہنایا اس کی گردن تھپک کے ایلچی بہادر نے للکار کے کہا: امیر یہ کسی پرانی ندی کا کنارہ ہے گھانس بھی سبز ہے۔ اس لئے پانی ہوگا۔ لیکن گھانس کے اس پار کسی کے جانور چر رہے ہیں۔"

تیمور نے ریت پر سورج کی جگمگاہٹ سے بچنے کے لئے پیشانی پر ہاتھوں کی چھتری سی بنائی اور کہا۔

"مجھے تو صرف گھوڑے ہی نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے بھیڑ بکریوں کا ریوڑ قریب ہو۔ اگر ہے تو یہ جانور ترکمانوں کے ہوں گے۔ احتیاط سے آگے چلو۔"

کارواں نئی الغور فوجی دستہ بن گیا۔ صرف بیس بھرے۔ پہلے تو اسلحہ سے لدے ہوئے ٹٹو روکے گئے اور چشم زدن میں تیر سب میں تقسیم ہو گئے۔ سب نے کمانیں کڑی کیں۔ گھوڑوں کی چال بدل گئی اور جنگ کے عادی گھوڑے بھی سمجھ گئے کہ اس سبز گھانس تک پہنچنے سے پہلے محنت اور زحمت ہے۔

اور پھر ایک ریلے میں اس دھندلے گذ کے یہ بائیسوں سوار ہری ہری گھانس تک پہنچے جو گھوڑوں کے ٹخنوں کے برابر اونچی تھی۔ یہاں میلی نم مٹی اور دلدل میں درختوں اور بیلوں کا ایک جھنڈ بھی تھا، جو معلوم نہیں اس سینکڑوں فرسنگ لمبے ریگستان میں کیسے زندہ تھا۔ جن سواروں کے گھوڑے چر رہے تھے، وہ اپنے گھوڑوں کی طرف لپک کر ان پر سوار ہونے لگے اور انھوں نے بھی اپنی کمانیں کڑی کیں۔

اتنے میں اپنے تیر، چھلانگیں مارتے ہوئے، گھوڑے کی رکابوں پر تقریباً نیم استادہ ہو کر اولجائی چلائی۔ "سلطان حسین۔ سلطان حسین۔"

کڑی کمانیں ڈھیلی ہو گئیں، ایک ملا جلا مرحبا کا شور بلند ہوا۔ گھوڑوں کی سرپٹ چال دھیمی ہو گئی۔ تیر ترکشوں میں واپس چلے گئے اور اولجائی سب سے

پہلے اپنے گھوڑے سے کود کے، اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔ اس کا جسم وزنی تھا، تیمور کو اس کی پھرتی پر حیرت ہوئی۔

اس نے سلطان حسین کو گھسیٹ کے گھوڑے سے اتارا اور چلا کے اس نے تیمور سے کہا "حالانکہ چلانے کی ضرورت نہیں تھی" میں نے کیا کہا تھا؟ میں نے کیا کہا تھا؟ کہ آج سلطان حسین سے ملاقات ہوگی"۔

تیمور کو یہ ملاقات یاد تھی۔ بہت اچھی طرح۔ اسے خیال تھا کہ سلطان حسین اسے طعنہ دیگا۔ چغتائی مغلوں سے دوستی کا۔ تیمور نے اس ملاقات کے دوران میں اپنے آپ کو جس قدر حقیر محسوس کیا۔ اس کے بعد پھر کبھی نہ کیا کیونکہ سلطان حسین نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ نہ طعنے کا۔ نہ ملامت کا۔ اس کے برعکس سلطان حسین بھاری بھرکم جسم جو زرہ کے نیچے اس گرمی میں بھی اطلس سے لدا تھا مارے خوشی کے ہانپ رہا تھا۔

درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے ایک حسینہ اپنے رہوار کی لگام ہاتھ میں تھامے ہوئے نکلی، اور بے ساختہ اپنے گھوڑے سے کود کے اد لجائی سے لپٹ گئی۔ اور اد لجائی ہراتی فارسی اور ترکی کا فرق بھول کے بار بار کہتی رہی "شگرم۔ خواہرم"

یہ سلطان حسین کی ملکہ دلشاد خاتون آغا تھی۔

تیمور اور سلطان حسین کبھی ایک دوسرے سے اس قدر قریب نہیں ہوئے تھے جیسے کہ اس دن قزل قم کے بے پایاں طوفانی، سرخ ریگستانی سمندر کے اس ہرے بھرے نخلستانی جزیرے میں۔

تیمور کے حکم کا انتظار کئے بغیر ایلچی بہادر نے خیمے کھڑے کرنے کا حکم دیا۔ کالے کالے سمور کے گول گول خیمے، جو دور سے ترکمانوں کے خیمے معلوم ہوتے تھے اور اس لئے اس علاقہ میں محفوظ تھے۔

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

خشک نمکین گوشت کے ٹکڑے ابلتے ہوئے پانی میں ڈال دیئے گئے۔ کیونکہ ابلا ہوا گوشت بہر حال خشک گوشت سے زیادہ مزے کا ہوتا ہے اور اس جلتی ہوئی دوپہر کو درختوں کے جھنڈ کے سائے میں ایسی ضیافت ہو لی جس کے آگے ایران اور توران کی تمام ضیافتیں ماند تھیں۔ اس غربت میں بھی دلشاد خاتون کی خورجی میں زعفران تھا جو پلاؤ میں ڈالا گیا۔ پگھلی ہوئی چربی میں دبنے تلے گئے جن کو ایک دن پہلے سلطان حسین نے ترکمانوں کے ایک گلے سے خریدا تھا اور جب دانتوں کو مسواک کر کے، اور ہاتھوں پر لگی ہوئی چربی نرم نرم گھانس سے پونچھ کے سب نے اوک بھر بھر کے، بلکہ چشمے سے منہ لگا کے گھوڑوں اور غزالوں کی طرح چشمے کا پانی پیا، تو یہ پانی جنت کے نہروں کے پانی کی طرح شیریں اور خوشگوار تھا۔

دلشاد خاتون آغا جب جھک کے چشمے کا پانی پی رہی تھی، تو پانی آئینہ بن گیا۔ بھورا تابجیک لبادہ، سر پر جواہرات سے لدی ہوئی کلاہ، دونوں شانوں اور سینے پر بل کھاتی ہوئی بھورے بھورے بالوں کی گندھی ہوئی دو دو لٹیں۔ پانی کے آئینے میں ایک اور حسینہ ابھری، ایک اور دلشاد، جو اس ریگستان میں ماری ماری نہیں پھر رہی تھی جو گویا اس چشمے کی پری تھی۔

[یہ سب تشبیہیں اور لجائی کی تھیں۔ کیونکہ تیمور نے کبھی دلشاد کو نظر بھر کے نہیں دیکھا، اس قیامت کی طرح گرم لیکن دلفریب دوپہر کو بھی نہیں۔ اور سلطان حسین کی تو وہ بیوی ہی تھی۔ اس کے عکس کو دیکھ کر شاعری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر اپنے بھائی کی تمام بیویوں میں اور لجائی کو دلشاد ہمیشہ سے بہت پیاری معلوم ہوتی تھی۔ وہ مبہوت ہو کے دلشاد کو اور اس کے عکس کو دیکھتی رہی]

اور اس دن، اس سہ پہر کو رات کے بجائے دن ہی کو خیمے نصب ہو چکے تھے۔ خیمے میں تیمور اور سلطان حسین مستقبل کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ یہاں

درختوں کی چھاؤں میں، گرم گرم لُو اور ریت کے دامن میں ٹھنڈے چشمے کے کنارے دلشاد کی آنکھ لگ گئی۔ اور راولجائی ایک پیڑ کے سہارے بیٹھ کے اونگھنے لگی۔ اور جہانگیر اس کی گود میں سر رکھ کے سو گیا۔

۹

[ہم امیر تیمور گورگان .....

[ہم امیر تیمور گورگاں جو ربع مسکون کو تسخیر کر کے رہیں گے، ہمیں اپنی عظمت کی قسم ہے کہ اولجائی کی یاد دل سے محو نہیں ہوتی۔ قضا و قدر پر ہمارا اختیار نہیں... ہیں فرد واحد تیمور جس کو اس دن اس سپاہی نے تیمور لنگ کہا تھا اور جس کو میری پیٹھ کے پیچھے ساری دنیا تیمور لنگ کہتی ہے۔ کشادہ پیشانی، سرخ و سفید، سیاہ ریش شیر دل، میں تیمور جب اولجائی کو یاد کرتا ہوں تو دل سینے سے باہر نکل آتا ہے اور آج اس کا بھائی اس دوسرے خیمے میں میرا قیدی ہے، صبح تک مجھے اس کی زندگی یا اس کی موت کا فیصلہ کرنا ہے۔

ایام کے شب و روز کے پٹے ہوئے مہرے، اس طرح گھوم رہے ہیں جیسے یہ بیتی ہوئی بازی کسی نے ابھی تک نہ جیتی ہے نہ ہاری ہے۔

مشورہ میرا تھا۔ اور مشورہ غلط تھا۔ خوارازمیوں کا کیا اعتبار۔ ان کا دل اس کھاری جھیل کی طرح کھارا ہے، جس میں آمو دریا اور سیر دریا گرتے ہیں، مگر اس کی نگینی

کو کم نہیں کر پاتے۔

خوارزمیوں کا کیا اعتبار۔ اور ایک دن میں خوارزمیوں سے ان کی بدسلوکی کا بدلہ لے کر رہیوں گا لیکن خوارزمی تاتاران زرّیں خیل کے باجگذار تھے اور زرّیں خیل اور چغتائیوں میں نہ کبھی بنی ہے نہ کبھی بنے گی۔

قراقم کا کالا کالا کالا ریگستان۔ کالے ٹیلے۔ جلتا سورج، گھوڑوں کی گردنوں پیٹھوں رانوں سے اٹتا ہوا پسینہ، گرد میں اٹے ہوئے خود، گرد پوش داڑھیاں۔ تھکے ہوئے گھوڑوں کی تھکی ماندی ہنہناہٹ اور جب ہم منزل مقصود پر پہنچے تو محض ایک سراب ملا۔ سراب میں تو خیر یہی ہے کہ پانی نہیں ہوتا، ریت ہی ریت ہوتی ہے۔ خوارزم میں ریت کے اوپر ہی اوپر جال بچھا ہوا تھا۔ غلطی میری ہی تھی۔ میں نے ہی سلطان حسین کو خوارزم چلنے کی ترغیب دی تھی۔ وہ تو کابل واپس جانا ہی چاہتا تھا کہ چغتائیوں سے پھر ایک بار اپنی کھوئی سلطنت چھینے لیکن چالیس سپاہیوں سے کہیں کھوئی ہوئی سلطنت چھینی جا سکتی ہے۔ کئی آوازوں نے چپکے چپکے ہم سے کہا: "بھاگ یہاں سے بھاگ" اور مجھے اپنا دشمن اپنا محسن بایزید جلائر یاد آگیا۔

خوارزم سے کئی سرگوشیاں سنائی دیں، یہاں کی چھتیں خیموں کے کپڑے کی طرح نوکدار نہیں تھیں، مسطح چھتیں، جن میں مٹی اور خاشاک کے تنکوں پر سبزی جمی ہوئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے چوبی دروازے جن پر تبریزی نقش کاری تھی۔ خوارزم کے شہر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تورانی خاک پر ایرانی دنیا آباد ہے۔

میں نے سلطان حسین سے کہہ دیا تھا [سلطان حسین فربہ جسم، دراز قد] چنگیز کی اولاد نرینہ کو خوارزمیوں سے مدد کی توقع تو بیکار ہے۔ لیکن ہمیں پناہ مل جائے گی۔ گرمیوں کے ایام تک۔ اور گرمیوں میں چغتائیوں کا لشکر، پہاڑوں میں واپس چلا جائے گا چغتائیوں کے سمندروں کو ایسک کول کا خنک خنک پانی پینے کی عادت ہے اس کے

بغیر ان سے گرمیاں نہیں کٹتیں۔ چغتائی شہسواروں کے راہواروں کو خان تینگری کے علاقہ
زاروں میں صنوبروں کے ٹھنڈے سائے کے نیچے اودی اودی گھانس چرنے کی عادت
ہے۔ اس کے بغیر وہ گرمیاں نہیں گزار سکتے۔ میں نے سلطان حسین سے کہا تھا کہ اگر
خوارزمی ہمیں پناہ دیں تو گرمیوں میں ہم پھر واپس چلیں گے۔ سمرقند کے جوار سے
یرلاسوں کو جمع کریں گے، کابل اور فرغانہ کی وادیوں سے جلائروں کے دفادار مغلوں اور
ترکوں کو چنیں گے۔ اور اس کے بعد تو غلوق خاں سے مقابلہ کریں گے۔

مگر خوارزم کی نیچی نیچی مسلح چھتوں کے نیچے جو مخلوق تھی، اس کے دل میں دغا اور
لالچ تھی اور ہم سے ایک درویش نے کہا۔

"سلطان حسین یہاں سے بھاگ، تیمور گورگان یہاں سے بھاگ۔ خوارزم کے
صوفیوں کے دل میں بجز دغا اور حرص کے کچھ نہیں۔ وہ اس فکر میں ہیں کہ تم دونوں کو پکڑ کے
تو غلوق خاں کے ہاتھ بیچ دیں۔ تمھاری عورتوں کو کنیز بنائیں، تمھارے بچوں کو غلام
بنائیں۔ بھاگو یہاں سے بھاگو۔"

خوارزم کے لشکریوں کے بشرے سے چالاکی ٹپکتی تھی اور ان میں سے ہر ایک کی
گویا چار چار آنکھیں تھیں، اور یہ دیکھ رہے تھے کہ ہم کتنے ہیں، کس ترکیب سے زندہ
گرفتار ہو سکتے ہیں، اور پھر ہم سے کہا گیا کہ صبح کو ہمیں صوفی کے دربار میں پیش ہونا ہے۔

تب اولجائی نے مجھ سے کہا: "یہاں آکر ہم نے غلطی کی۔" اور دلشاد آغا نے
سلطان حسین سے کہا "یہاں آکر ہم نے غلطی کی۔" اور سلطان حسین نے کچھ نہیں کہا۔ اس
نے میری طرف غصے سے دیکھ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ہم اپنے گھوڑوں
پر سوار ہو گئے۔ ہم خیمہ دوزوں کے محلے سے گذرے، ہم کبابیوں اور نان خطائی
بنانے والوں کے تنوروں پر گئے اور ان سے گرم گرم کباب اور نان لے ہم نے
اس طرح اپنے گھوڑوں کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیں کہ کسی کو شک نہ ہو کہ ہم شہر

کے باہر جارہے ہیں۔

لیکن جب ہم فصیل کے دروازے کے پاس پہونچے تو جھپٹ کے ہم نے سنتریوں کے سر کاٹ لئے۔ فصیل کے دروازے کھولے، اور اس عرصہ میں سارا شہر جاگ اٹھا۔ اب ہم نے لگامیں کھینچیں اور دانتوں میں دبالیں، اپنی کمانیں کڑی کیں، اور چٹکیوں میں تیر پکڑے۔

(سلطان حسین نے یہاں سلطانی نہیں کی، جو میں نے کہا مان لیا)۔ ہم ایک بلند ٹیلے پر چڑھ گئے اور اندھیرے میں ہم نے مشعلوں کا ایک سرپٹ طوفان آتا دیکھا کئی سو خوارزمی ہوں گے جو آگ کے طوفان کی طرف چلے آرہے تھے، جب وہ ٹیلے کے نیچے پہنچے تو ہم دونوں اور ہمارے ساٹھ ساتھیوں نے اپنے آپ کو اس آگ میں جھونک دیا۔

ہم بگولے کی طرح ٹیلے کی چوٹی سے نیچے اترے۔ ہم نے اپنے قلب پر اپنی چھوٹی چھوٹی نورانی ڈھالیں تان لیں، ہم نے اپنی دوہری طاقتور کمانیں تان لیں، جن کی تانت میں موت کا زمزمہ تھا۔ ہم نے فولاد کی نوک والے تیروں کی ایسی بارش کی، کہ کسی خوارزمی کی زرہ اس کے آگے ٹھہر نہ سکتی تھی۔ ادھر کمان تنتی، تیر چھوٹتا ادھر ایک ثانیہ میں دوسری چٹکی میں دوسرا تیر۔

ہم پر موت کا نشہ طاری تھا، دشمنوں کے اس مسلح جنگل میں ادھر سے ادھر اس طرح گھستے، اور پھر باہر نکلتے، جیسے فرزیں مقابل کے پیادوں کے ہجوم میں۔ جب ہم خوارزمیوں کے درمیان دور تک گھس جاتے، اور وہ ہمیں گھیرنے کی کوشش کرتے تو ہم اس طرح صاف بچ کر نکل آتے جیسے قصاب کی چھری دنبے کی ران کے گوشت میں ضرورت ہوتی تو ہم اپنی خمدار بھاری تلواریں نکال لیتے، اور باہر آکے پھر تلواروں کو نیام کر کے چٹکیوں میں تیر پکڑتے اور کمان کھینچتے۔

پھر میں نے دیکھا، ایلچی بہادر کا گھوڑا گرا اور وہ اس صفائی سے کود کے الگ جا کھڑا ہوا کہ میں نے کہا "مرحبا" وہ آسانی سے ذرا پیچھے ہٹ کے کسی اور گھوڑے پر سوار ہو سکتا تھا۔ کتنے گھوڑے تھے، جن کے سوار گر چکے تھے دونوں طرف۔ لیکن وہ اسی طرح ٹیلے کے ایک بڑے پتھر کے پیچھے سے تیر چلاتا رہا، یہاں تک کہ خوارزمی سواروں نے اسے گھیرنا شروع کیا، اور یہ دیکھ کر کہ ایلچی بہادر میں شجاعت زیادہ ہے، اور عقل کم۔ میں نے جھپٹ کے اپنی تلوار سے اس کی کمان کی تانت کاٹ دی۔ اس نے اپنی خون میں ڈوبی ہوئی سیاہ داڑھی کے بال اپنے دانتوں میں چبائے اور وہاں سے ہٹ کے اس گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا جو پاس ہی اپنے خوارزمی آقا کی لاش کے پاس، دونوں پیر اٹھائے ہنہنا رہا تھا۔

پھر میں نے سلطان حسین کو دیکھا۔ خوارزم کے نائب والی کے بہت قریب۔ ایک وار میں اس نے پرچم پر وار کا ہاتھ قلم کر کے پرچم گرا دیا۔ اور دانت میں عنان پکڑے، تلوار سوتے وہ نائب والی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ خوارزمیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میں نے جا کو برلاس سے کہا کہ وہ اولجائی کے قریب ہا رہے۔ مجھے اولجائی کے چہرے پر ہراس کی شکنیں اچھی طرح یاد ہیں۔ پھر میں نے بسم اللہ کہہ کے اپنا گھوڑا بڑھایا۔ سلطان حسین کا رہوار تنگ سے حلقے میں چکر کاٹ رہا تھا اور چاروں طرف تلواریں چمک رہی تھیں۔ میں نے .....

خیر میں اُسے خوارزمیوں سے چھڑا لایا۔

اور پھر میں نے ہم میں سے جتنے کچھ بچے تھے، ان کو یلغار کا حکم دیا، اور پھر ایک بار ہم نے اپنے آپ کو خوارزمیوں میں جھونک دیا۔

مجھے رہ رہ، مجھے یاد ہے کہ سلطان حسین کا گھوڑا تیر کھا کے گرا مجھے یاد ہے کہ تڑپ کر دلشاد خاتون آغا اپنے گھوڑے سے اتر پڑی، اور اپنا گھوڑا سلطان حسین کو دیدیا

دلشاد کا چہرہ گرد اور پسینے میں اٹا ہوا تھا اور اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ بجلی کی سی سرعت سے سلطان حسین اس گھوڑے پر سوار ہوا اور چشم زدن میں وہ میرے ساتھ تھا۔ اور میں نے سوچا کہ جب تک نائب والی کا کام تمام نہ ہو ہمارے مٹھی بھر ساتھیوں کی زندگی کی کوئی صورت نہیں۔ میں نے کمان کڑی کی، اور آنکھ کے پاس جھک نشانہ لگایا۔ نائب والی کے عین اسی جگہ تیر لگا۔ آنکھ کے نیچے رخسار پر۔ اور وہ اپنے گھوڑے پر اس ضرب کی شدت سے جھک گیا۔ میں نے اپنی زین پر جھک کے رکاب پر پورا زور ڈال کے ایڑ لگائی۔ اور چلتے چلتے پوری طاقت سے نائب والی کے سینے پر نیزہ بھونک دیا جو آر پار ہو گیا۔

نائب والی کے گرتے ہی خوارزمی تتر بتر ہو گئے۔ اور جو اس کی لاش اٹھانے کے لئے ٹھہرتے تھے انھیں ہم نے تیر برسا کے بھگا دیا۔

ٹیلے پر دلشاد پیدل کھڑی کانپ رہی تھی، اور اس کے پاس اولجائی تھی، اس کی کمان برابر کھنچتی رہتی اور اس کا نشانہ کسی اور تاتاری سے کم نہیں تھا۔ میں نے دلشاد کو اولجائی کے گھوڑے پر سوار کرایا۔ اور رات کے تاریک پردے میں ہم نے خوارزم کے جنوب کا رخ کیا۔

ہم آٹھ آدمی تھے۔ سات آدمی تھے جو خوارزمیوں کے ہاتھ زندہ بچے تھے میں اور اولجائی اور جہانگیر سلطان حسین اور دلشاد خاتون آغا۔ جاکو برلاس اور ایلچی بہادر۔ اور اس رات اس چشمے کے کنارے ہمیں سلطان حسین کے تین بدخشانی سپاہی اور ملے گروہ تین گھوڑے چرا لے گئے۔

ہم نے یہ تصفیہ کر لیا کہ ساتھ ساتھ رہنا موت کو دعوت دینا ہے۔ سلطان حسین اور دلشاد کے ساتھ میں نے جاکو برلاس کو بھیجا۔ اور طے یہ ہوا کہ ہم کابل اور بامیان کی پہاڑیوں میں پھر ملیں گے، مگر الگ الگ راستوں سے سفر کریں گے۔ ہمارے

تین گھوڑے تو بدخشانی سپاہیوں نے چرا لئے تھے۔ ایک گھوڑا میرے پاس رہ گیا جس پر میں نے اولجائی کو سوار کیا، اور اپنے ہاتھوں میں اس کے گھوڑے کی لگام تھامی ایلچی بہادر نے ایک خچر پر کھانے پینے کا سامان، جو کچھ نقد و جواہر رہ گیا تھا وہ سب لادا اور اس کی لگام تھامی، اور ہم دونوں چلے۔ اس زمانے میں میں کئی فرسخ پیدل چل سکتا تھا۔ میں لنگڑا نہیں ہوا تھا۔

۱۰

[میں لنگڑا نہیں ہوا تھا۔ ۔ ۔ ۔]

میں نے اولجائی کی طرف دیکھا اور اولجائی نے میری طرف۔ اب صبح ہو رہی تھی۔ اور صبح کی روشنی میں ریت چمک رہی تھی۔ ریت کی بے پایاں دنیا تھی۔ میں نے اولجائی کی طرف دیکھا اور اولجائی نے میری طرف۔ میں کہنیوں تک ریت میں دھنس جاتا تھا" اور یہ دیکھ کر اولجائی کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

اور میں نے بھی اس کی ہنسی سے متاثر ہو کے قہقہہ لگایا۔

اور پھر ریگستان اور صبح کے نور کے درمیان میں نے عہد کیا کہ ایک دن میں خوارزم کے صوفیوں سے اس غداری کا بدلہ لوں گا۔ جس طرح آج اولجائی بیابان بیابان دشت دشت پر بشان پھر رہی تھی جس طرح آج دلشاد خاتون آغا کو پیدل ہو کے اپنی جان اور عزت خطرے میں ڈال کے سلطان حسین کی جان بچانا پڑی، اسی طرح ایک دن خوارزم کی حسین ترین خاتون میرے لشکر کے بس میں ہو گی۔ میں کسی حسین خاتون کو اپنے لئے نہیں

دھوپ میں اس نے پہلی بار ایک گدھ کو اپنے سر پر منڈلاتے دیکھا۔ گدھ اس مینار کی چوٹی پر اطمینان سے جا پہنچا، جس کی سیڑھیوں پر سلطان حسین نے پناہ لی تھی۔ کبھی اُس کی انگلیوں سے شاہین و شہباز اڑتے تھے، اور ارض و سما کا شکار کرتے تھے اب گدھ کو اس کی بوٹیاں چُننے کا انتظار تھا۔ روز صبح اور شام یہ گدھ چکر لگانے لگا۔ ابھی تو یہ تفتیش کو نکلا ہے، کر اور کتنے دن یہ گھستی ہوئی جان جیسے جلائے گی اور پھر اس کے ساتھ اور گدھ آئیں گے۔ سلطان حسین کی نظروں میں وہ ہزاروں منظر گھوم گئے جو اس نے زندگی بھر دیکھے تھے۔ جب جنگ میں فتح کے بعد اس کا گھوڑا چکر کاٹتا اور سڑتی ہوئی لاشوں سے چیختے ہوئے گدھ چلا کے کچھ دور اوپر اڑتے اور پھر ضد کر کے اپنے خوان ضیافت پر بیٹھ جاتے۔

سلطان حسین نے اس شدید گرم جلتی ہوئی رات کو ایک کپکپی سی محسوس کی۔ گویا گدھ ابھی تک اسی طرح تاک لگائے بیٹھا ہے۔ کچھ خواب کچھ بیداری میں اسے محسوس ہوا کہ جیسے گدھ کی بھی ایک ٹانگ لنگڑی تھی، تیمور کے لنگ کی طرح، اور یہی اس مردار خور کی قسمت کا راز تھا۔ یہ کہ اس مردار خور گدھ نے بھی شاید کسی شہباز یا شاہین کی بہن سے شادی کی تھی، اور اب وہ شاہین کا گوشت کھانے کے لئے قزل قم کے نکیلے پتھروں پر اپنی چونچ تیز کر رہا تھا۔ اور شاید یہ سب بھیانک خواب ہو۔ مگر اس سے پہلے کے خوابوں میں دلشاد اس کے ساتھ تھی، اب دلشاد بھی اس سے بچھڑ چکی تھی۔ اس کا حرم، اس کی کنیزیں، اس کے صبا رفتار راہوار، اس کے جاں نثار جلائر، اس کے وفادار محمود اور رھمند، اس کے کالے گیسوؤں اور تیز پنجوں والے ترکمان سب پہاڑوں، گھاٹیوں، دریاؤں میں منتشر ہو چکے تھے، کوہ و دشت و دریا پر غاصب کا قبضہ تھا۔

اور اب جب کہ سب کچھ چھن چکا تھا، سلطان حسین کو قدر ہوئی کہ سب

چاہتا تھا کیونکہ مجھے اولجائی سے محبت تھی، نہ ہی اپنے لشکر میں کسی اور کے لئے ایلچی بہادر کے لئے جاکو برلاس کے لئے۔۔۔۔ یا شاید جہانگیر کے لئے۔۔۔۔ کیونکہ جہانگیر چند سال میں بڑا ہو جائے گا۔

میں نے جب قہقہہ لگایا تو اولجائی نے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

میں نے کہا: "میں خوارزم کی عورتوں سے تمھارا اور دلشاد کا بدلہ لوں گا۔"

اس پر اولجائی غصہ ہو کے بولی: "نہیں بدلہ نہ لینا۔ اس طرح بدلہ لینے میں تمھارا فائدہ ہوگا مگر ہمارا سراسر نقصان ہے۔"

وہ ہمیشہ اسی طرح کی باتیں کیا کرتی تھی۔

صبح کی روشنی پھیلی تو ہمیں ایک سوکھی ہوئی چراگاہ، اور ایک سوکھے ہوئے چشمے کے کنارے کچھ ترکمانوں کے خیمے ملے۔ ان ترکمانوں کے چرمی ملبوسوں سے ایسی سڑی بو آتی تھی کہ اولجائی نے اپنی ناک بند کر لی۔ مگر یہ ترکمان وفادار تھے۔ انھوں نے بھیڑ ذبح کر کے ہماری دعوت کی، اور ہمارے ہاتھ گھوڑے اور دنبے بیچے۔ اولجائی نے ان کی غلیظ، تیل اور چربی سے لپی ہوئی عورتوں کو موتیوں کے ہار دیئے۔ ان ترکمانوں کے گھوڑے بہت کام آئے

پھر تیمور نے یاد کیا۔

وہ باسٹھ دن جو ہم نے علی بیگ کی قید میں گذارے۔ میں نے اور اولجائی نے اور اولجائی جو جلائر شہزادی تھی، جس کے جد امجد چنگیز نے دنیا کو فتح کیا تھا۔ ہمارا قید خانہ مویشیوں کا اصطبل تھا۔ ہمارے کپڑوں میں مکھیاں، اور گوبر کے کیڑے اور چیونٹے جمع رہتے۔ گرمیوں میں معلوم ہوتا کہ ہمارا مغز پگھل جائے گا۔ اولجائی حسرت سے میری طرف دیکھتی، اور جب بے بسی کے عالم میں مجھے غصہ آنے لگتا تو وہ کھلکھلا کے ہنس پڑتی اور کہتی "کہ میرے آقا یہ دن بھی گذر جائیں گے۔"

اور جس دن سلطان حسین کی وفات کے بعد علی بیگ نے ہمارے جواہرات لے کے ہمیں رہا کیا۔ میں نے خدائے عزوجل سے عہد کیا کہ "میرے مولا، میں انسانوں کو قتل کروں گا، یا انھیں معاف کر دوں گا لیکن قید نہیں کروں گا۔"

اور اس طرح ہم اپنے کپڑوں کے ٹکڑوں، گوبر کے کپڑوں اور چیونٹوں سے رخصت ہوئے۔

۱۱

[وہ جو آج خاک کے نیچے دبی ہوئی ہمیشہ کے لئے سو رہی ہے اس زمانے میں جوان تھی، زندہ تھی، اور خوبصورت تھی۔ اس کا گداز جسم زندگی اور قہقہوں سے مالا مال تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اذیت اسے خاموش نہیں کر سکتی، اس کی ہنسی نہیں روک سکتی کبھی کبھی وہ سوچ میں پڑ جاتی اور خاموش ہو جاتی، مگر جب وہ تیمور کو اپنے سے زیادہ خاموش پاتی تو ایک نئی زندگی کی لہر قہقہہ بن کر اُسے زندہ کر جاتی]

[اور جب اولجائی قبر میں اتاری گئی ہے تو تیمور دُور تھا] لیکن اس نے وہ دن یاد کیا۔ جب اس نے اسے اپنے ہاتھوں قبر جیسے کنوئیں میں اتارا تھا۔ چغتائی شہسواروں سے بچانے کے لئے۔

لال لال سنگلاخ چٹانیں۔ دُور دُور تک ہواریت کے لال لال دروں سے سرخ۔ جیسے لاکھوں چیونٹیاں ہوا میں منتشر ہوں جیسے فضا میں روز نشور کی سی گرمی اور سرخی ہو۔ اینٹوں کی بھٹی کی گرمی۔ لیکن اس گرمی کے باوجود اس سال چغتائی شہسوار

خان تینگری کے ٹھنڈے ٹھنڈے صنوبروں کے سائے میں واپس نہیں گئے تھے۔ الیاس اور یکی جوک کے شہسوار ایسک کول کے کنارے کی ٹخنوں ٹخنوں اونچی گھاس میں گھوڑے نہیں چرا رہے تھے ان کے گھوڑے اب بھی ماوراالنہر کے مغرب میں تپتے ہوئے ریگستانوں میں دشمنوں کو تلاش کر رہے تھے، خود اس کو اور سلطان حسین کو۔ ان گھوڑوں کی لگاموں سے کھنچی ہوئی گردنیں بحیرۂ خوارزم اور بحیرۂ خزر کے کڑوے کھارے متواج — پانی کو دیکھتیں، بیزاری اور پیاس سے ہنہنانے کی آواز آتی، اور لگامیں پھر مشرق کی طرف مڑ جاتیں۔

جہاں جہاں کسی زرد رو گھاس کی چراگاہ میں، یا کسی چشمے کے کنارے، یا کسی دریا کی وادی میں چغتائیوں کے ہاتھوں ستائے ہوئے ترکمان چرواہے ملتے تیمور سے یہی کہتے "یاخواجہ، یا امیر ادھر خطرہ ہے" اور ترکمان چرواہیاں اپنی پتلی پتلی لمبی لمبی آنکھوں سے گھور گھور کے اولجائی ترکان آغا کو دیکھتیں۔ اور پھر اولجائی ترکان آغا کی مسکراہٹ وبا کی طرح سب میں پھیل جاتی۔

ایک لاغر سا گھوڑا تھا، جو علی بیگ نے کھٹملوں اور گوبر کے کیڑوں والے اصطبل سے چلتے وقت دیا تھا اس پر تیمور سوار تھا، اور ایک اونٹ تھا جس کی کھال جا بجا تک رہی تھی، اور خارش سے جسم پر کیڑوں کے تکے جمع ہوئے تھے۔ اس پر اولجائی سوار تھی۔

لال لال سنگلاخ چٹانیں، اور ہوا میں ریت کی لالی۔ قزل قم کی بے حد و انتہا سرخی۔ اور سرخی میں معجزے کہیں کھارے پانی کے چشمے، جن کو دیکھ کر گھوڑا ہنہنا کر پسینے سے شرابور گردن پھیر لیتا اور رونگٹوں کی طرح اس کے ایال کے بال کھڑے ہو جاتے اور اونٹ بے بسی سے بلبلا کے دوسری طرف دیکھنے لگتا۔ اور کہیں کہیں معجزہ کے طور پر میٹھے پانی کا ایک کنواں۔

اس کے کنوئیں کا اس احول سے کوئی تعلق نہ تھا، دور دور تک کہیں سبزی کا کوئی پتہ نہ تھا، اس کا امکان کم تھا کہ دشمن کے سوار یہاں تک آئیں۔ یہ ایک معجزہ ان سنگلاخ چٹانوں کے درمیان تہ بہ تہ، ان کراری چٹانوں کو کاٹ کر کسی زمانے میں کسی نے انسانوں کے لئے یہ کنواں کھودا ہوگا۔ اب کئی کئی فرسخ تک کوئی آبادی نہ تھی ترکمانوں تک کے خیمے کہیں نظر نہ آتے تھے۔ لیکن تیمور کو معلوم ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں یہاں سے قریب ہی دریا بہتا تھا، جو سیحوں کے پانی کو جیحون کے پانی سے ملاتا تھا۔ یہاں آبادی تھی لوگ رہتے تھے۔ جو وحشی قبیلوں، مغلوں اور ریگستان کی نذر ہو گئے۔ جن کو سٹ کے صدیاں گذر گئیں۔

اور اس کنوئیں کے کنارے چار جانداروں نے رات گذاری۔ تیمور نے۔ اولجائی ترکان آغا نے، لاغر گھوڑے اور خارش زدہ اونٹ نے۔

اور جب رات اندھیری تھی تو تیمور نے کہا: "شکرم"۔

اولجائی ترکان آغا کی آنکھیں گرم گرم نیند سے بند ہوئی جاتی تھیں۔ اس نے سوتے جاگتے میں کہا "ہوں"۔

بستر کے نیچے ریت سخت اور تکلیف دہ تھی۔ تیمور نے کہا "شکرم۔ اس طرح تو قزل قم کا یہ ریگستان ہمیں کھا جائے گا۔ ہماری ہڈیاں تک یہاں بھوک اور پیاس سے سفید ہو جائیں گی اور کسی کو خبر نہ ہوگی اور اس ریگستان میں بھی چغتائی ہر جگہ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں"۔

اولجائی نے ہنس کے کہا: "اچھا اب سو جاؤ۔ صبح کو اٹھ کے سوچیں گے، رات کو نیند نہ آئے گی تو صبح کو بادیہ میں سفر کرنے کی طاقت کہاں سے آئے گی"۔

تیمور نے کہا: "شکرم۔ میں سوچ رہا تھا کہ کچھ کرنا چاہیئے۔ اس ریگستان سے نکلنا چاہیئے۔ اگر میرے پاس صرف چند رفیق اور ہوتے۔ اگر میں اس قدر تیز سفر کر سکتا

کہ ان رفیقوں کو پا سکتا جو خوارزم کے قریب کے دیہاتوں میں چھپے ہوئے ہیں جیسے امیر سیف الدین جس کے ساتھ ہمارا جہانگیر ہے۔ اور آق بوغا اور ایلچی بہادر اور جاکو برلاس ہے۔ یہ اگر میرے ساتھ ہوتے یا میں ان کے پاس پہنچ سکتا یا میں انھیں پا سکتا۔ میں اتنا تیز سفر کر سکتا یا اکیلا سفر کر سکتا۔"

اولجائی چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اوپر نیلگوں آسمان تھا جس سے دن کی اڑی ہوئی سرخ خاک کے ذرے آہستہ آہستہ غیر مرئی طور پر برس رہے تھے۔ ان سے اوپر چمکتے ہوئے ستارے تھے، کہکشاں، اور لال تارے، اور سنہرے ستارے، اور ایک سبزی مائل تارہ۔ اور نیچے دور دور تک لال لال چٹانیں، اور ریت کی ہڈیوں اور پسلیوں جیسی شکنیں تھیں۔

اس جلائر شاہزادی نے اس سنگلاخ زمین، اور اس دور دراز آسمان کی طرف دیکھا اور چشم زدن میں فیصلہ کر لیا۔ اس نے تیمور کے دونوں ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں دبوچ لئے اور کہا: "اچھا آپ اکیلے جائیے اور انھیں ڈھونڈیئے۔"

"اولجائی۔ اولجائی۔ میں تجھے اس ریگستان میں تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔۔۔۔"

اولجائی نے جواب دیئے بغیر ایک سوال کیا: "یہ بتاؤ تمھیں یہاں واپس آنے میں کتنے دن لگیں گے؟"

"اگر زندہ رہا تو دو ہفتے۔" تیمور نے کہا۔ اور اب وہ بھی اٹھ بیٹھا۔

اولجائی نے اس کے چوڑے مضبوط شانے پر سر رکھا، اور اپنے زار و قطار اُمڈے ہوئے آنسو روکے اور کہا: "تیمور مجھے اس نیلگوں آسمان سے ڈر نہیں لگتا، جسے مغل پوجتے ہیں۔ مجھے اس سنگلاخ زمین سے ڈر نہیں لگتا جس پر کوسوں تک ایک سبز پتا نہیں۔ لیکن اگر تیرے جانے کے بعد چغتائی یہاں آپہونچے۔ اور میرا

وہی حشر ہوا جو چنگیز کی بیوی بورتے قی کا ہوا تو میں تیرے پاس کبھی واپس نہیں آؤں گی: میں اپنی جان دے دوں گی۔"

تیمور کی داڑھی کے کالے گھنے بال، اس کی دوہری زلفوں میں الجھ رہے تھے۔ تیمور نے اس کے رخساروں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "اولجائی۔ میں تجھ سے ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں کہ راویوں سے مفضول داستانیں نہ سنا کر۔ میں تجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ زندہ رہیں گے تو دونوں زندہ رہیں گے۔ اور اگر قسمت میں ہوگا تو رفیق مل ہی جائیں گے۔"

اولجائی نے اس کے ہاتھوں کو اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں سے لگایا: "تجھ پر میری ایسی ہزار جانیں قربان۔" مجھے اس کنوئیں میں اتار دے۔ اگر دشمن کے سپاہی آئیں گے بھی تو میں چٹانوں کے نیچے چھپ جاؤں گی۔ اور اوپر سے ڈول ڈال کے پانی لے جائیں گے۔ لیکن اس طرف شاید ہی کسی کا گذر ہو۔ لیکن اپنا وعدہ یاد رکھیو۔ اور پندرہ دن بعد آ کے مجھے لے جائیو۔"

اولجائی ذرا ہٹ کے بیٹھ گئی اور استقلال سے اس نے کہا: "کیسے نہیں ہو سکتا یہی تقدیر ہے۔ اور یہ ہو کر رہے گا۔ مگر پندرھویں دن آجانا۔"

دوسری صبح کو تیمور نے دور لے جا کر خارش زدہ اونٹ کو ذبح کیا۔ اور اس کا کچھ گوشت اولجائی کے ساتھ کنوئیں میں اتارا۔ آگ جلانے کے لئے گھوڑے کے گھانے کی سوکھی ہوئی گھانس دی۔ اس آوارہ گردی کے زمانے میں آدھا کچا اور آدھا پکا گوشت کھانے کی ان دونوں کو عادت ہو گئی تھی۔ اپنے لئے ایک روٹی رکھی اور باقی ساری روٹیاں اولجائی کے لئے کنوئیں میں اتار دیں۔ آگ جلانے کے لئے چقماق کے پتھر دیئے۔ ایندھن کے لئے اونٹ کا محمل دیا۔ اور پھر کنوئیں کے کنارے سے اسے جھانک کے دیکھا۔ پانی تہہ میں آئینہ کی طرح چمک رہا تھا۔ اور کنارے

کی چٹان پر جس کا رنگ پانی کی ریت سے سرمئی ہو رہا تھا۔ اولجائی کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اس کا چہرہ تمتما رہا تھا، اور دونوں چوٹیاں سینے پر گندھی ہوئی پڑی تھیں، اس کی آنکھیں خشک تھیں اور ایک بے پایاں محبت اور قربانی کی چمک سے جگمگا رہی تھیں۔ اور اس کے ہونٹوں پر امید اور بے بسی کی وہ مسکراہٹ تھی جس نے سخت سے سخت مصیبت میں بھی تیمور کا دھیان بٹائے رکھا۔

"اولجائی فی امان اللہ"

"فی امان اللہ۔ آج سے پندرھویں دن"۔ اولجائی کی آواز اور صدائے بازگشت کنوئیں میں گونج گئی۔

"پندرھویں روز"

اور پندرھویں دن جب وہ واپس آیا، اپنے بیٹے جہانگیر کے ساتھ۔ اور سیف الدین، اور جاکو برلاس، اور آق بوغا، اور ـــــ قاضی زین الدین کے ساتھ۔ اور اس نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا۔ ..... تو وہ جو کنوئیں میں اتاری گئی تھی، چونکی تک نہیں۔ اس نے گردن اٹھا کے یہ معلوم کرنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ گھوڑوں کی ٹاپ دشمنوں کے راہواروں کی تھی یا تیمور کی۔ ان دو ہفتوں میں اس کنوئیں کی زندگی نے اسے عارضی طور پر اندر سے تسخیر کر لیا تھا، یہاں سے آسمان کا صرف ایک حصہ نظر آتا تھا، وہی حصہ جسے کنوئیں کے منہ نے معین کیا تھا، اور دو ہفتہ تک شب بہ شب ساعت بہ ساعت وہی ستارے اسی جگہ نظر آتے تھے۔ دن کو پرچھائیں، اسی جگہ پڑتی اسی جگہ کھسکتی۔ اور شام کے اژدہے جیسے دھندلکے میں جذب ہو جاتی۔ اوپر آسمان تھا۔ اس کے نیچے زمین، اور یہ جگہ زمین سے بھی نیچی تھی۔ ایک دو دن تک اسے یہ محسوس ہوا تھا کہ قبر بھی ایسی ہی کوئی جگہ ہوگی۔ جو زمین سے زیادہ نیچے ہے۔ جہاں کوئی ساتھی کوئی رفیق نہیں۔ جہاں رالتوں کو آسمان پر ستارے بھی نہیں چمکتے۔ صرف انسان

ہوتا ہے۔ اور اس کا خدا۔

اور وہ کیفیت جو سالہا سال کی ریاضت سے پیدا ہوتی ہے، ساعت بہ ساعت اولجائی ترکان آغا کے دل میں پیدا ہوتی گئی۔ یہ کہ یہ سب ہیچ ہے۔ یہ زمین یہ آسمان۔ یہ زندگی۔ دشت بہ دشت، قریہ بہ قریہ۔ کوبکو۔ یہ کہ وہ خود ہے، جب تک زندہ ہے، ہے۔ اور اس کے سوا صرف خدا ہے، جو ہر جگہ ہے۔ باقی جو کچھ ہے غول بیابانی ہے۔ ریگستان کے غیر مرئی جن اور عفریت ہیں خواہ وہ سپاہی ہوں۔ دوست ہوں یا دشمن ہوں، خون کے پیاسے ہوں یا چاہنے والے ہوں۔ سب کے سب لاحول کے مستحق ہیں۔ ان تمام صحرائی آسیبوں، ان غول بیابانی کے خوف کو اس نے سب سے بڑے خوف کے سپرد کر دیا۔ اس کا خوف جس کا بنایا ہوا نیلگوں آسمان تھا جہاں اکیلی راتوں میں تاروں کی قندیلیں جلتی تھیں، جس کا بنایا ہوا اس کنوئیں کا ٹھنڈا پانی تھا جسے اس سرخ ریگستان کی گرم ہوا خشک نہیں کر سکتی تھی۔ اور یہ خوف ایک طرح کی محبت بھی تھی۔ جیسے تیمور سے اس کے رشتہ میں محبت اور خوف دونوں منسلک تھے۔

اس کنوئیں میں جب دوسرا دن گذرا، اور دوسری رات ہوئی تو رات کو اس خوف کے دامن میں جو رحمت بھی تھا، جو سہارا بھی تھا اولجائی نے پناہ لی۔ اس نے جب وضو کیا، تب بھی اسے شک تھا کہ یہ محض رسمی عبادت ہے یا کچھ اور بھی ہے۔ لیکن جب اس نے عشا کی نیت باندھی تو اس اندھیری اکیلی رات میں، اس سنسان صحرا، اس سنسان آسمان میں اس کے اور کسی اور کے درمیان ایک ایسا رشتہ بندھ گیا جو ہر طرح کی رسمی عبادت سے بالاتر تھا۔ اسے یاد نہیں رہا کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں، کتنی دیر تک قرآن کی آیتیں پڑھتی رہی اور کون کون سی آیتیں پڑھتی رہی، وظیفہ میں کیا کیا پڑھا اور کیوں پڑھا۔ اور اس حالت میں کب سو گئی۔

تیسرے دن جب وہ سو کر اٹھی تو آفتاب اس کنوئیں پر اس طرح طلوع ہوا

جیسے گھر کے صحن میں، جیسے خانہ باغ کی روش پر طلوع ہوتا ہے۔ اب اس دشت، اس بادیہ، اس گرمی، اس تنہائی، اس زمین، اس آسمان سے اس کی صلح ہو چکی تھی۔ کوئی اور اس کے ساتھ تھا۔ وہ جو ہر جاندار سے زیادہ جاندار تھا۔ اس نے سڑے ہوئے اونٹ کے گوشت کو دور پھینک دیا اور کنویں کے ٹھنڈے پانی میں بھگو کے سوکھی روٹی کا ٹکڑا کھایا۔ اور پھر کنویں کی دیوار کی چھاؤں میں اس بے وقت کی نماز کی نیت باندھی، اور ساری دنیا سے غافل ہو گئی اور اسی طرح دن گذرتے گئے۔ سوکھی روٹیاں کم ہوتی گئیں۔ وہ کمزور ہوتی گئی۔ پندرھویں دن جب تیمور نے کنویں کے سرے پر آ کے آواز لگائی: "اولجائی اولجائی" تو اس نے گردن تک نہیں اٹھائی لیکن جب تیمور کے قریب سے جہانگیر نے اسے پکارا "اتا۔ اتا" تو وہ چونک پڑی۔ گویا وہ کڑی جو ان دو معبتوں میں اس دنیا سے، اس تنہائی میں ٹوٹی تھی، پھر جڑ گئی۔ وہ ماں بن گئی ایک خالقانہ جذبہ تھا جو بیدار ہوا، اور اس نے سر اٹھا کے اوپر دیکھنا چاہا کہ کنویں کی دیواریں، اور محدود آسمان کا حدود اربعہ دست و گریباں ہو کے گھوم گیا، اور وہ بیہوش ہو گئی۔

"بیٹی ایسا ہوتا ہے۔" بابا زین الدین نے کہا: "کبھی کبھی ایسی جھلک دکھائی دے جاتی ہے کبھی سرراہے فقیر کو وہ نعمت عطا ہو جاتی ہے جو زاہد کو عمر بھر کی ریاضت میں نہیں ملتی۔ کیونکہ جہاں امتحان ہے وہاں زحمت ہے، اور جہاں زحمت ہے وہاں اطمینان ہے۔ زندان چاہ بھی ایک مقام ہے۔ جس سے گذرنا ضروری ہے۔ کیونکہ جو اس سوئی کے ناکے سے ہو کر نہ گذرے، وہ قلب ضمیر سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور یہ نعمت ہر ایک کو میسر نہیں آتی۔"

اولجائی سر جھکا کر سنتی رہی۔ پھر اس نے کہا: "مگر بابا زین الدین میرا دل پھر اب پہلا سا ہو گیا۔ اب مجھے نماز میں حضور قلب میسر نہیں آتا۔ مجھے اب پھر اپنے

سے زیادہ عزیز چیز اب بھی اس کی اپنی تھی اور اس کے قبضے میں تھی یہ اس کی اپنی جان تھی۔ وہ زندہ تھا۔ اور یہ خود ایک بہت بڑی امید تھی یہ کہ اس کی سانس چلتی ہے اور ہر سانس پر شکر واجب ہے۔ یہ کہ جب تک سانس ہے، زندگی ہے حال بھی ہے اور مستقبل بھی۔ اور یہ حقیقت بھوک سے بڑھ کر تھی گدھ سے بڑھ کر شکست سے بڑھ کر۔ یہ کہ اور سب نعمتیں اس نعمت کے لیے ہیں اور اگر یہ نہیں تو کچھ نہیں لیکن اگر کچھ اور نہیں تو یہ تو ہے۔

اور وہ اسی کو لیے آن چھپا تھا، چھپتا پھرتا تھا، افریقہ کے کالے شکاری پجاری کی طرح جس کے سر کا شکار کھیلا جا رہا تھا، یا ہر صحیح النسب تاجدار کی طرح جس کا تاج اس کا مرض الموت ہے۔

بیٹے اور اپنے خاوند سے ویسی ہی محبت ہے' اس دن جب میں نے جہانگیر کی آواز سنی' جس نے مجھے ماں کہہ کے پکارا تو معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی خواب تھا جس سے میں یکلخت بیدار ہوئی' جیسے اصل حقیقت یہی دنیا تھی جس میں تیمور ہے' جہانگیر ہے، میں ہوں اور وہ دنیا.... وہ محض کنوئیں کی دنیا تھی۔

زین الدین بابا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا: "بیٹی یہ راز تیری سمجھ میں نہیں آئے گا تجھے جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہی کام کر۔ اپنے شوہر کا خیال رکھ۔ اپنے بیٹے کی پرورش کر۔ اور صرف یہ سمجھ لے کہ جس طرح تو جہانگیر کو پالتی ہے جیسے تو نے اسے اس وقت پالا جب وہ تیرے پیٹ میں تھا' اسی طرح تجھے اس نے پالا اور اپنی ذات میں سمیٹ لیا جو اس کنوئیں کا مالک ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ اگر میں بتا سکتا ہوں تو یہ کہ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کنوئیں کے امتحان کے بعد تیرے اور تیمور کی زندگی کے دن بدل گئے خاص طور پر تیمور کی زندگی کے....."

"بابا زین الدین۔ کیا میری زندگی کے دن نہیں بدلیں گے؟"

"بدلیں گے ضرور بدلیں گے۔ لیکن تیمور کی زندگی کے دن بہت بدلیں گے کیونکہ چاہ کنعان اور زندان مصر دونوں کی صعوبت یوسف نے اٹھائی لیکن یعقوب اور اسحاق کی جانشینی یوسف کے حصے میں نہیں آئی' یہودا کو ملی جو یوسف کے ان سوتیلے بھائیوں میں سے تھا جنھوں نے یوسف کو قید کیا تھا' اور یہودا عیاش تھا لیکن یوسف پاکدامن تھا۔

ہراساں ہو کے اولجائی نے کہا: "بابا زین الدین میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔ کیا آپ کا مطلب ہے۔ تیمور مجھے چھوڑ دے گا۔ یا تیمور دوسری شادی کرلے گا۔ میں نے کبھی اسے منع نہیں کیا لیکن اس نے آج تک کسی اور عورت

کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھا۔"

بابا زین الدین نے وزرابے صبری سے کہا "اولجائی بیٹی۔ اور سب عورتوں کی طرح تیری عقل بھی ہے۔ یہ تو کنوئیں کا مالک ہی بہتر جانتا ہے کہ تو تیمور کو پہلے چھوڑے گی یا تیمور تجھے پہلے چھوڑے گا۔ لیکن ایک بات جو تو شاید سمجھ لے یہ ہے کہ اس نے تیمور کو نہیں، تجھے چاہ میں اسیر کیا اور اس کا کوئی کام دانش اور مصلحت سے خالی نہیں۔ مگر ان باتوں کو، اس خیال کو چھوڑ۔ یہ دنیا چار دن کی ہے۔ اپنے شوہر اور اپنے بچے کے ساتھ خوش رہ۔"

اولجائی کے جانے کے بعد زین الدین نے سوچنا شروع کیا۔ کڑیاں تھیں کہ جڑتی ہی چلی جاتی تھیں۔ حالانکہ ان کڑیوں کو جوڑنا گستاخی تھی بہت سے کنوئیں سچے ہوتے ہیں اور بہت سے جھوٹے۔ چاہ کنعان سچا کنواں تھا، اور چاہ بابل، چاہ نخشب جھوٹے کنوئیں تھے۔ آنکھ کا کنواں سچا ہے، اور نرگس کا جھوٹا۔ حالانکہ نرگس آنکھ سے زیادہ پرانی ہے۔ آنکھ کے چشمے میں نظر کا موتی ہے اور نظر کے چشمے میں سراب ہی سراب ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کس چشمے کا پانی کھارا ہے اور کس کا میٹھا۔ یہ تو وہی جانتا ہے جس نے میٹھا اور کھارا پانی بنایا ہے۔

بابا زین الدین کو کازغان کی اس نواسی، اس جلائر شہزادی پر رشک آرہا تھا جس کنوئیں میں وہ تھی، اس میں کیا شک ہے کہ وہ کنواں کھرا کنواں تھا سچا کنواں تھا، یوسف کا نظر کا، امتحان کا، تزکیہ نفس کا کنواں۔ وہ زندان جس سے رہائی ملتی بھی ہے تو انعام نہیں ملتا، کیونکہ اس کا انعام اتنا زیادہ ہے کہ وہ اس دنیا میں دیا نہیں جا سکتا۔ یوسف کا انعام مصر کی حکومت نہیں تھی۔ اصل انعام تو وہ تھا جو بیوہ کو ملا۔ دانش انسانی ہیچ در ہیچ ہے اور دانش برہانی ہی جاتی ہے کہ کیوں امتحان یوسف کا لیا جائے اور اس کا انعام بیوہ کو ملے۔ کیوں اولجائی

کنویں میں اتاری جائے اور تیمور کی قسمت کا ستارہ چمکے۔ اس مفروضے کا کوئی منطقی ثبوت نہ تھا۔ لیکن یہ بغیر منطق کے ظاہر اور ثابت تھا۔ اور اس رات قاضی زین الدین نے تیمور سے کہا۔

"امیر! میں نے تم سے کہا تھا کہ تو غلوق خاں سے اور چغتائیوں سے صلح نہ کرنا کیونکہ چٹان سے دودھ نہیں نکل سکتا۔ لیکن تم نے میری بات نہ مانی۔ خیر جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب تمھیں سمرقند کی ان بیٹیوں کی قسم ہے جو مغلوں کے اصطبلوں میں بھیڑوں کا دودھ دوہتی ہیں، اور راتوں کو ان کے ساتھ بیسواؤں کا گناہ کرنے پر مجبور ہیں کہ جاؤ اور چغتائیوں کا مقابلہ کرو۔ اب مجھے امید ہو رہی ہے کہ خدا تمھیں ظفریاب کریگا......"

تیمور نے کہا: "قاضی زین الدین۔ میرے پاس لشکر نہیں۔ فوج نہیں۔ دولت نہیں۔ صرف چند ساتھی ہیں جو میری اور اپنی جان کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ لیکن چغتائیوں سے مقابلہ کرنے کا تو بہر حال میں نے، اور سلطان حسین نے عہد ہی کر رکھا ہے۔ کیوں کہ آپ کو میری فتح کی بشارت ہوئی ہے؟"

بابا زین الدین نے ارشاد کیا: "امیر تیمور گورگاں میں صوفی نہیں۔ کیونکہ میں نے کبھی صوف نہیں پہنا۔ میں نے کچھ دن تک تمھارے والد تارگائی کا زاویہ اور تکیہ سنبھالا تھا لیکن وہ روشنی جو باطن سے آتی ہے جو اندر سے روشن ہوتی ہے مجھے نصیب نہیں ہوئی کیونکہ جو راستہ میں نے شروع سے اختیار کیا وہ شریعت کا تھا طریقت کا نہیں تھا۔ میرا سوز و گداز اخلاق کی حد سے آگے نہیں بڑھ پایا۔ میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بشارت ہوئی ہے کیونکہ میں بشارت کا اہل نہیں جو زمین بنجر یا شور ہوتی ہے۔ اس پر سبزہ نہیں جم سکتا۔ نہیں مجھے ایسے ہی خیال ہوا۔ دنیا اور اہل دنیا، اور اہل دنیا کے دلوں کو دیکھتے دیکھتے مجھے خیال ہوا

کہ بعض اشارے ایسے ہوتے ہیں، بعض نشانیاں ایسی ہوتی ہیں، جن سے آنے والی باتوں کی خبریں مل سکتی ہیں۔ اولجائی ترکان آغا نے دریا کے قریب چاہ میں جو ایک ہفتہ گذارا وہ ایک نشانی تھا۔ اور دوسری نشانی یہ ہے کہ اس قید چاہ کا اصلی فائدہ تم کو پہنچے گا۔ امیر گورگاں یہ سب قیاس ہی قیاس ہے۔ اس سے زیادہ مجھ سے کچھ اور نہ پوچھنا۔ اس سے زیادہ میں خود اور کچھ نہیں جانتا۔"

۱۲

اب گویا تیمور کی یادداشت سب کی یادداشت تھی مگر نظام الدین شامی نے بین السطور یہ لکھا۔

"میری آنکھوں نے دیکھا کہ سات مینار تھے، کٹے ہوئے سروں کے مینار، کئی قدم اونچے، مصر کے اہرام کی طرح نیچے کی طرف پھیلے اور پھر اوپر اُن کا قطر کم ہو جاتا ہے۔ اور میری آنکھوں نے دیکھا کہ یہ سات مینار سروں کے بنے ہوئے تھے۔ مردوں، عورتوں، بچوں، جوانوں، بوڑھوں کے سروں کے بنے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے باہر کی طرف چُنے ہوئے تھے۔ کسی کٹے ہوئے ماہ طلعت چہرے کی زلفیں، کسی اور کٹے ہوئے چہرے کی حنائی ریش سے الجھی ہوئی تھیں۔ کہیں کئی کئی بچوں کے چہرے ایک ساتھ چُنے ہوئے تھے، جیسے کسی بڑی عمارت میں بڑی بڑی اینٹوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی چنی گئی ہوں۔ میں نے ریشمی لٹوں کے پہلو میں گنجے سر دیکھے، میں نے نیلی نیلی آنکھیں دیکھیں

جو مردہ چہروں سے جھانک رہی تھیں، اور میں نے ایسے چہرے دیکھے جنھیں خنجر کی ناہنجار چمک نے موت کے لحظے میں حیوانوں کی صورت مسخ کر دیا تھا لیکن میں نظام الدین شامی اقرار کرتا ہوں کہ ان بیس ہزار چہروں کے متعلق میں نے کچھ نہیں لکھا۔ حالانکہ میں بھی اسی شہر حلب کا رہنے والا ہوں۔ کیوں امیر صاحب قراں نے بیس ہزار کو موت دی اور مجھے زندگی دی۔ اس لئے کہ میں امیر کی ظفریابی کی داستان لکھوں۔ لیکن جب میں حلب کے قلعے کو یاد کرتا ہوں، اپنے بلا دا پنے شہر کے حصار کو تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شیطان میرا گلا گھونٹ رہا ہے اور میرا گلا کسی طرح گھٹ نہیں چکتا۔ کیونکہ اپنے بچپن سے مجھے یہ حصار یاد ہے جو ایک سنگلاخ چٹان پر بنا ہوا تھا، اور جہاں کہیں ڈھلوان مٹی تھی وہاں اسے اینٹوں سے چُن دیا گیا تھا۔ میرے حصار کی بلندی سنگین تھی۔ ڈھلوان کے نیچے خندق تھی، اور خندق سے لامتناہی سیڑھیاں شروع ہوئی تھیں۔ اس کے بعد پہلا دروازہ آتا ہے جو حصار کا نہیں چٹان کا دروازہ تھا۔ اس کے برجوں پر کئی سو سال تک ترک اور شامی افرنگ کے صلیبیوں سے اور افرنگ کے صلیبی ترکوں اور شامیوں سے لڑ چکے تھے، اور پھر لامتناہی سیڑھیوں کے بعد حصار کا اصلی دو منزلہ دروازہ تھا۔ ..... اور دروازہ کے قریب ایک چوکور مینار اونچا اونچا کھڑا تھا جسے خالد بن ولید سے بہت پہلے رومیوں نے بنایا تھا۔ . . .

میں اسی سوچ میں تھا اور محو تھا۔ شاید میرے چہرے پر رنج عالم کے بڑے گہرے آثار ہوں گے میں اپنے آنسوؤں کو ضبط کر رہا تھا لیکن اگر میری صورت پر غم کا غبار تھا تو یہ میری کوشش کے باوجود تھا۔ اور اس عالم میں اپنے تاتاری ساتھیوں کے قہقہے سے میں یکلخت چونک پڑا اور میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔

میرے میزبان الحاج امیر سیف الدین نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس نے

کہا، "میرے ساتھیو۔ ہمارا یہ مہمان نظام الدین شامی بڑا سخت جان ہے۔ جب امیر صاحب قران نے بغداد فتح کیا تو یہ پہلا آدمی تھا جو فصیل سے اترا، اور اس نے جان کی اماں پائی، لیکن جب امیر صاحب قران نے حلب کے حصار کا محاصرہ کیا تو یہ پھر حلب کے حصار میں محصور تھا۔"

اور اس کے بعد جنگلی بوغا نے لکڑی کا چمچہ میری طرف بڑھا دیا، جو ضیافت کے دستر خوان کے اطراف گردش کر رہا تھا، میری باری آئی تو میں نے چمچہ بھر روغن احمد باوام سے تربتر شوربا پیا۔ اور چمچہ اپنے بائیں ہاتھ کی طرف بڑھا دیا۔

لیکن امیر سیف الدین پر سرور کا عالم طاری ہو رہا تھا۔ شام سے وہ بجائے کومیس کے جس کا وہ عادی تھا، لبنان کے میووں کی بنی ہوئی فرنگی شراب پی رہا تھا، جسے اس علاقے میں صلیبیوں نے رائج کر رکھا تھا، اور ان پر خدائے تعالےٰ کا عذاب نازل ہو۔

امیر سیف الدین نے الف لیلےٰ کے راویوں کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا "یا نظام الدین شامی۔ تم جو آج اس قدر ملول ہو اور محزون ہو۔ گویا عزازیل تمہاری گردن پر سوار ہے، جیسے تمہارے کانوں میں صور اسرافیل پھونکا جاچکا ہے۔ تمہارے اس ملال میں ضرور کچھ نہ کچھ بھید ہے۔ ضرور یہ کسی حلبی دوشیزہ کا غم ہے جو تمہارے سفید گنجے سر اور تمہاری حنائی داڑھی کو اپنی انگلیوں سے مروڑتی ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " اور جب تاتاری ایک قہقہہ لگا چکے، اور ایک نے میری پشت پر زور سے ایک ہاتھ جمایا۔ مزاحا۔ تو امیر سیف الدین نے اسی انداز سے کہا، "نظام الدین ہمیں بھی اس حسینہ، اس بثینہ، اس لیلےٰ، اس لبنیٰ، اس محبوبہ اس مطلوبہ، اس قتالۂ عالم کا نام بتاؤ، تاکہ ہم اسے تمہارے لئے حلب کی گلیوں سے ڈھونڈھ لائیں۔"

میں نے اپنے دل میں کہا: "شاید اس کا سر لیتے آؤ۔ سروں کے مینار سے"
اور اس وقت مجھے خیال آیا، ایک داستان کا جو میں نے قاہرہ کی گلیوں میں سنی تھی۔ اس زمانے میں قاہرہ کے طعام خانوں میں الف لیلۃ و لیلۃ کی ہزار کہانیوں کا بڑا چرچا تھا، جن میں ایک سندباد جہازی کی کہانی تھی۔ جس نے سات سفر کئے اور ہر سفر میں ایک نئے ملک میں گیا اور ایک نئی مصیبت سے دوچار ہوا۔ میں ابھی تک اپنے ہی ملک میں تھا، مگر ایک پیر تسمہ پا کی ٹانگ تھی۔ کہ میری گردن کو جکڑے ہوئے تھی۔ اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر زندہ رہنا ہے تو عقل کی تلوار کو تیز کر۔
تاتاریوں کے قہقہوں کی میں نے پرواہ نہیں کی۔ سب کی طرح میں نے اپنی انگلیاں گرم گرم چربی دار گوشت میں گاڑ دیں جو بادام اور پستوں اور دوسری مغزیات میں دفن تھا۔ جس سے لونگوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ اور میں نے امیر سیف الدین سے کہا۔
"خدا کی رحمت ہو امیر سیف الدین پر۔ میں نے ایسا لذیذ گوشتابہ اپنی عمر میں کبھی نہیں کھایا۔ اور یا امیر سیف الدین جس طرح آپ نے میری محبوبہ کی تعریف کی۔ اسے لیلیٰ اور لبنیٰ اور مبشنہ سے تشبیہہ دی تو مجھے کچھ کچھ شک یہ ہوتا ہے کہ عنفوان شباب کے زمانے میں جب آپ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تھے تو وہاں سے نجد بھی گئے اور مجنوں اور قیس عامری اور جمیل کی خلعت پہن لی کیونکہ آپ ماشاء اللہ سے زندہ دل نوجوان ہیں۔"
اب تاتاری ساتھیوں نے میرے ساتھ اپنے میزبان پر قہقہہ لگایا۔ اور الحاج امیر سیف الدین بھی خوش دلی سے ہنس پڑا۔
اور تب گفتگو کا موضوع بدلنے کے لئے میں نے کھنکھار کے کہا: امیر سیف الدین۔ اللہ تعالےٰ نے امیر صاحب قران کے امیروں میں آپ کو کئی لحاظ

سے ممتاز کیا ہے۔ وہ عزیز ہے اور اس نے آپ کو عزت دی، وہ شکیل ہے اور اس نے آپ کو وجیہہ شکل و صورت عطا کی۔ وہ عقیل ہے۔ اور اس نے آپ کو فراست اور ذکاوت بخشی۔ اور کئی لحاظ سے اس نے آپ کو فضیلت دی۔ آپ کو امیر صاحب قراں کے پہلے شاہزادے جہانگیر کا ہم سبق، ہم رکاب، ہم پیالہ، ہم نوالہ بنایا۔۔۔۔۔"

میں نے دیکھا کہ جب میں نے جہانگیر کا ذکر کیا تو امیر سیف الدین نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اس کی آنکھوں سے تمسخر کی جھلک رخصت ہو گئی۔ میں کہتا گیا۔

آپ کو عزت بخشی، دولت بخشی، شجاعت بخشی، آج میں آپ کے دسترخوان پر آپ کا نمک کھا رہا ہوں اور خوش ہوں۔۔۔۔"

امیر سیف الدین نے دفعتاً بات کاٹ کے مصنوعی عربی بلاغت کے ساتھ کہا: "یا نظام الدین شامی یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ یہ سارا نمک خدائے ذوالجلال کا بنایا ہوا ہے، جسے اس نے کچھ ہمیں کھانے کے لئے عطا کیا، اور کچھ محبوبوں کے چہروں پر تقسیم کر دیا تاکہ ہم ان کی طرف اس طرح مائل ہوں جیسے اچھے کھانے کی طرف۔ اور میں اور آپ سب امیر صاحب قراں کے نمک خوار ہیں اور کسی کے نہیں۔"

"سچ ہے۔ سچ ہے" تاتاری مہمانوں نے کہا۔

میں نے کہا: "یا امیر سیف الدین یہ آپ کی بلند حوصلگی ہے۔ یہ شاہزادہ جہانگیر کے ساتھ کا اثر ہے کہ رحمت بران تربت پاک باد۔ یا امیر سیف امیر صاحب قراں نے مجھے آپ کے سپرد فرمایا ہے۔ کہ میں ایک ظفرنامہ کی صورت میں امیر صاحب قراں کی عالمگیر فتوحات کا حال لکھوں۔ اور آپ میری مدد کریں۔ ایک مسئلہ جو مجھے پریشان کر رہا ہے یہ ہے کہ امیر صاحب قراں اور امیر حسین میں اتنی محبت تھی، اتنی دوستی تھی، عزیز داری تھی پھر یہ کیا غضب ہوا کس طرح منافرت بڑھی کس

طرح اس کا انجام جو ہونا تھا وہ ہوا۔ یا امیر سیف الدین کیا محض اتنی ہی بات تھی جیسے شیخ سعدی شیرازی نے یوں بیان کیا ہے کہ "دو سلطان در اقلیمے نہ گنجند"

میری طرح اور سب تاتاری سردار ہمہ تن گوش بن کے امیر سیف الدین کا جواب سننے لگے۔ اور امیر سیف الدین جو اس سے پہلے حجاز اور مصر اور شام اور عراق کی سرزمینوں سے گذر چکا تھا، اس وقت الف لیلہ و لیلہ کے سحر سے محفوظ نہیں تھا۔ کچھ شراب کے اثر سے، کچھ تصنع سے وہ معمولی سی بات بھی اس طرح بیان کرتا تھا گویا یہ ایک معمہ ہو۔ اور ہر تجربہ یوں ظاہر کرتا ہو گویا یہ کوئی عجوبہ ہو۔

"یا نظام الدین شامی۔ یا میرے رفیق بوغایان و بہادران۔ امیر حسین اور امیر تیمور صاحب قراں کی مخالفت کا قصہ اس زمانے کا ہے جب میں کم سن اور کم شعور تھا۔ لیکن جو کچھ میں نے دیکھا اور جو کچھ میں نے سنا ہے وہ ایسا ہے کہ سوئی کی نوک سے آنکھوں کے پپوٹوں کے اندر تحریر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

"یہ کہ اے فاضل و کامل مرد شامی میں نے دیکھا ہے کہ اس سرائے فانی میں جب کوئی واقعہ ہونے والا ہوتا ہے تو وہ حکیم وہ خالق جس نے مجھے اور تجھے پیدا کیا ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی سبب تصنیف کرتا ہے اور یہی سبب تقدیر ہے۔ یاد ہے جب چغتائیوں سے لڑائی ہو رہی تھی تو تغلق تیمور کے انتقال کی خبر آئی اور الیاس خواجہ اوغلان کو اپنے باپ کا تخت سنبھالنے کے لئے ماوراءالنہر سے مراجعت کرنی پڑی۔ نہ یہ واقعہ پیش آتا نہ اتنی آسانی سے اہل سمرقند چغتائیوں کے خلاف بغاوت کرتے۔ نہ امیر حسین کو اتنی آسانی سے ماوراءالنہر پکے ہوئے پھل کی طرح مل جاتا۔ نہ اس میں اتنی لالچ ہوتی۔ نہ اس سے اور